رجسٹرڈ نمبر

نخل

قیمت فی کاپی ۸ر

آئندہ جنوری کا "نگار" ریاض حیرابادی نمبر ہوگا۔ مفصل اشتہار صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ فرمائیے

نگار

یازفتچوری

شمار ۵

چندہ سالانہ صہ ر

جلد ۴۲ فہرست مضامین نومبر سنہ ۴۲ء

ملاحظات ۲
بعض عربی اور انگریزی الفاظ کی مماثلت! ۳
مکتوبات نیاز ۲۹
مرزا جعفر علی خاں اثر بی۔اے ... ۳۵

جسونت کنور ... ۲۵

ملاحظات

آئندہ ماہ دسمبر سے

کاغذ کی گرانی و کمیابی کی داستان آپ کہاں تک سنیں گے اور میں کب تک دُہراؤنگا یہ بوجھ تو کسی نہ کسی طرح اُٹھانا ہی ہے۔ ہم نے شروع سال سے نگار کا مسطر شمسی کی کا اثر مقالات پر نہ پڑے، لیکن چونکہ لکھنؤ طباعت کے لحاظ سے بہت بدقسمت واقع ہوا ہے اور باریک کتابت خصوصیت کے ساتھ اچھی نہیں چھپتی، اس لئے آئندہ ماہ دسمبر سے نگار بجائے ۳۱ سطر کے ۲۸ سطر کے مسطر پر چھپے گا اور حجم میں بھی کچھ اضافہ کر دیا جائے گا، اسی کے ساتھ سرورق کے صفحات بھی علیحدہ ہوں گے۔ اس طرح مقالات کے لئے زیادہ گنجایش نکل آئے گی اور خط بھی کچھ واضح ہو جائے گا۔

رفتار جنگ

عرصہ ہوا میں نے ایک غزل لکھی تھی جس کا ایک شعر تھا:

من کہ بندم صد تمنایم بہر فردائے تو — تو کہ ہر فردا ز عہد خود گسستن آمدی

معلوم نہیں اُس وقت مخاطب کون تھا، لیکن اب تو یہ خطاب جنگ کی دیوی ہی کے لئے موزوں ہے۔ بہت سی وہ توقعات جو گرمیوں میں پوری ہوتی نظر آتی ہیں، جاڑوں پر ٹل جاتی ہیں اور جاڑوں میں پوری ہونے والی امیدیں پھر گرمی تک ملتوی ہو جاتی ہیں، جو صورت کل تھی وہ آج نہیں اور جو آج ہے اسے کل تک قیام نہیں الغرض جنگ پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

اسٹالن گراڈ جس پر ہٹلر کو اپنے پروگرام کے مطابق ۳۰ ستمبر کی صبح تک قابض ہو جانا چاہئے تھا، آج ۳۰ اکتوبر کی شام تک بھی اس کا فیصلہ نہیں ہو سکا اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ کیا ہونا ہے۔ جرمنی نے اس شہر کو فتح کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ لاکھوں سپاہی، ہزاروں ہوائی جہاز، سیکڑوں دبابے، اس نے اس آگ میں جھونک دئے، لیکن تیس چالیس میل کا یہ قطعۂ زمین اب تک سر نہ ہو سکا

حقیقت یہ ہے کہ جو جرأت پامردی روسی آبادی نے اس محاذ میں پیش کی ہے، اسکی مثال نہ دُنیا کی پچھلی تاریخ میں ملتی ہے اور نہ شاید آئندہ مل سکے!

"تل اوٹ پہاڑ" اُردو کی مشہور مثل ہے، لیکن اس کا صحیح تجربہ جنگ کے دوران ہی میں ہوتا ہے، جب ایک ایک گھڑی بلکہ ایک ایک پل میں زمانہ کا دھارا بدلدینے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس ایک ایک پل سے فایدہ اُٹھانے یا نہ اُٹھانے کا نام فتح و شکست ہوتا ہے۔

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹)

بعض عربی اور انگریزی الفاظ کی مماثلت!

علم الانسان (Ethnology) میں شعبۂ لسانیات (Philology) ہمیشہ بہت دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، کیونکہ مختلف قوموں کی جسمانی و ذہنی مماثلت و مشارکت کے مطالعہ میں اس شعبہ سے بڑی مدد ملتی ہے، لیکن چونکہ انسان کی کوئی ایسی مکمل تاریخ موجود نہیں ہے جو ہمیں یقینی طور پر سمجھنے میں مدد دے سکے کہ آفرینش کے بعد اس کے اندر کیا کیا اجتماعی و تمدنی انقلابات رونما ہوئے، اُس کی مختلف جماعتیں اپنے اولین مرکز سے کب، کہاں کہاں اور کن حالات میں منتقل ہوئیں اور اُن کی زبانوں میں کیونکر تدریجی اختلاف پیدا ہوا، اس لئے "لسانیات" کا مطالعہ شاید کبھی مکمل نہیں ہو سکتا اور آئے دن کے جدید انکشافات اور انکشافات سے زیادہ انسانی قیاس آرائیاں کبھی اسے ایک علم محکم (Positive Science) کی حیثیت نہیں دے سکتیں۔

ماہرین نے انسان کی دو بڑی تقسیمیں کی ہیں ایک ایرین، دوسرے سامی اور اول الذکر کو بھی دو شاخوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک مغربی، دوسرے شرقی۔ مغربی شاخ میں تمام یوروپ کے باشندے (بہ استثنائے ترک، ہنگری کی Magyar قوم۔ Pyrenees کے Basques اور لاپ لینڈ کے فنیوں کے) شامل ہیں اور مشرقی شاخ میں آرمینیا، افغانستان، ایران اور شمالی ہند کے باشندے۔ ان دونوں شاخوں کا ایک ہی تنہ سے متعلق ہونا ان کی لسانی خصوصیات سے ثابت کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ سنسکرت، زند (قدیم ایرانی زبان) یونانی، لاطینی (جو فرانسیسی، اطالوی، اسپینی، پرتگالی اور رومانوی زبانوں کی ماں اصلی ہے) کلٹک Celtic (جو ویلس، اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کی زبان ہے) کا تھک Gothic (جسے قدیم ٹیوٹانک زبان سمجھنا چاہئے اور جس سے انگریزی، جرمنی اور سویڈن و ناروے کی زبانیں نکلی ہیں) اور سلافی زبانیں (جو آسٹریا اور تمام مغربی روس میں رائج ہے) سب ایک ہی تنہ کی شاخیں ہیں۔ یعنی اصل زبان جس سے یہ سب زبانیں نکلی ہیں وہ تو اب مفقود ہو گئی ہے، لیکن ان کی ایک دوسرے سے مماثلت یہ بات ضرور ظاہر کرتی ہے کہ ان سب کا ماخذ ایک ہی ہے۔

طبقات الارض اور آثار قدیمہ کی تحقیقات کے سلسلہ میں اس کا بھی علم حاصل ہو چکا ہے کہ وہ اصل قوم جس کی دو شاخیں مشرق و مغرب میں پھیل کر اختلاف زبان کا باعث ہوئیں، وسط ایشیا میں رہتی تھی اور اسی کی زبان کی یہ تمام شاخیں ہیں جو ایرین زبان سے موسوم ہیں۔

دوسری انسانی تقسیم سامی کہلاتی ہے۔ یہ سام بن نوح کی نسل سے بتائی جاتی ہے اور اس میں حبشہ، فنیقیا، عرب، فلسطین، شام اور ممالک دجلہ و فرات کے باشندے شامل ہیں۔

ان اقوام کے متعلق جدید ترین نظریہ یہ قائم کیا گیا ہے کہ ... ۴ سال قبل مسیح جب ایک وحشی خانہ بدوش قوم عرب سے عراق کی طرف آئی تو یہاں تورانی[1] آبادی پائی جاتی تھی۔ جو بہت زیادہ مہذب و شائستہ تھی۔ اور خط میخی استعمال کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ دو صدی کے اندر عرب کی اس وحشی قوم نے تمام تورانی علاقہ پر اپنی حکومت قائم کر لی اور اس طرح سامی قوم کے ان وحشی افراد کو چاروں طرف پھیل جانے کا موقعہ ملا۔

کہا جاتا ہے کہ سامی اقوام کی زبان (جس میں عبرانی، ارامی، فنیقی، آشوری، بابلی، عربی اور حبشی زبانیں شامل ہیں) ایرین زبان سے بالکل مختلف ہے اور ان میں کوئی ایسی مماثلت نظر نہیں آتی جس کی بنا پر ان دونوں کا رشتہ جوڑا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ سامی اور ایرین زبانوں کی نوعیت میں واقعی بڑا اختلاف

---

[1] تورانی کے اصل معنے غیر ایرانی کے ہیں اور جس طرح عرب اپنے سوا سب کو عجمی کہتے ہیں اسی طرح ساسانی شاہان ایران کے زمانہ میں اہل ایران اپنے سوا سب کو تورانی کہتے تھے اور اسی بنا پر لسانیات میں تورانی سے ہر وہ قوم مراد لی جاتی ہے جو ایرین نہیں ہے۔

پایا جاتا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان میں کوئی ایک زبان دوسری زبان سے متاثر نہیں ہوئی غالباً صحیح نہیں۔

اگر سامی اور ایرین اقوام ایک دوسرے سے اس لئے متمایز سمجھی جاتی ہیں کہ ایرین وسط ایشیا کے باشندے تھے اور سامی عربستان کے تو بھی ان دونوں کا ایک دوسرے سے اس حد تک جدا رہنا کہ ایک کی زبان کا اثر دوسرے کی زبان پر نہ پڑے سمجھ میں نہیں آتا۔

اس زمانہ کو چھوڑئے جب عربوں کی ترقی کا اثر سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا اور یورپین زبان، یورپین کلچر عربی زبان اور عربی تہذیب سے متاثر ہو رہا تھا، اس سے بہت پہلے بھی سامی و ایرین قوموں کے میل جول کی شہادتیں ہم کو تاریخ سے ملتی ہیں چنانچہ Lenormant کا یہ نظریہ قریب قریب تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جس وقت سامی نسل کے لوگ ریگزار عرب سے نکل کر دجلہ و فرات کی وادیوں میں پہونچے تو وہاں Hamitic قوم پہلے سے موجود تھی۔ یہ قوم وسط ایشیا سے آئی تھی اور اس کی زبان اور اس کی تہذیب و معاشرت کا اثر سامی زبان و تہذیب پر بہت کچھ اثر پڑا۔ پھر اگر یہ صحیح ہے تو سامی اور ایرین زبانوں کا امتزاج عہد قدیم میں بھی مستبعد نہیں تھا اور ہو سکتا ہے کہ ایرین اور سامی زبانوں میں جستجو سے ہمیں بہت سے مشترک الفاظ ملجائیں۔

میرا یہ خیال اس وقت قایم ہوا جب انگریزی فرہنگوں اور خصوصیت کے ساتھ ویبسٹر کے مطالعہ سے انگریزی اور عربی زبان کے بہت سے الفاظ میں گھلی ہوئی مماثلت نظر آئی۔ یقیناً ان میں بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں جو بعد کو عربوں اور مغربی اقوام کے میل جول سے ایک دوسرے کی زبان میں منتقل ہوئے لیکن ہو سکتا ہے کہ بعض الفاظ کی مماثلت کی تاریخ زیادہ قدیم ہو۔ بہرحال یہ چیز غور کرنے کی ہے۔

میں فی الحال ایک فہرست اُن الفاظ کی درج کرتا ہوں جو عربی اور انگریزی میں مماثل نظر آتے ہیں اور چونکہ سامی زبانوں کی یہ خصوصیت کہ وہ دوسری زبانوں سے متاثر ہونے کی اہلیت بہت کم رکھتی ہے، تسلیم کر لی گئی ہے، اس لئے خیال غالب یہی ہے کہ انگریزی میں یہ الفاظ عربی زبان سے آئے ہوں گے۔ فارسی و انگریزی کے مماثل الفاظ میں نے ترک کر دئے ہیں کیونکہ یہ دونوں ایرین زبانیں ہیں اور ان میں مماثلت پایا جانا حیرت انگیز نہیں۔

۱- Arise (ارائس یا ارائز) انگریزی میں اس لفظ کے متعدد معنے ہیں لیکن ہر معنی میں اُٹھنے، بلند یا نمایاں ہونے کا مفہوم ضرور پایا جاتا ہے۔ عربی اسی کے قریب المخرج لفظ راس ہے، جس کے معنے سر کے ہیں اور مفہوم و تلفظ دونوں طرح ان کی مماثلت ظاہر ہے۔

۲- Arouse (اراؤس یا اراؤز) اس کا صحیح مفہوم کسی جذبہ کو حرکت میں لے آنا ہے اور یہی مفہوم قریب قریب عربی میں حرص کا ہے جسکی مماثلت انگریزی لفظ سے ظاہر ہے۔

۳- Asperse (ایسپرس) اس کا مفہوم ہے پھیلانا، منتشر کرنا، اور بالکل یہی مفہوم عربی میں "فرج" کا ہے۔ انگریزی لفظ کا آخری حصہ اس سے بہت ملتا جلتا ہے۔

۴- Athel (ایتھل یا ایسل) انگریزی میں شریف النسل کو کہتے ہیں، اور عربی میں لفظ اثل بھی اسی معنے کا حامل ہے۔ سیکسن ناموں میں لفظ Ethel کی شمولیت اکثر پائی جاتی ہے جیسے Etheling (شریف نوجوان) Ethelard (شریف ذہین)، Ethelwald (شریف حکومت)

۵- Avail (اویل) اس کے معنی ہیں کسی فایدہ کے قابل ہونا۔ عربی میں لفظ بل ہے جس کا مفہوم بھی یہی ہے، چنانچہ جس وقت درخت پھل لے آتا ہے تو کہتے ہیں "بل الشجر" اور ان دونوں کا قریب المخرج ہونا ظاہر ہے۔

۶- Assassin (اسیسن) ماڑ ڈالنا اور AX (ایکس) تبر یا کلہاڑی، عربی میں ایک لفظ حز ہے جس کے معنے کاٹ ڈالنے کے ہیں ان تینوں کی مماثلت مفہوم و تلفظ کے لحاظ سے قابل غور ہے۔

۷- Azimuth (ازمتھ) فلکیات کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد وہ قوس فلک ہے جو سمت الراس سے افق تک پائی جاتی ہے اور افق کو زاویہ قایمہ بناتی ہے۔ یہ لفظ عربی سمت یا اسمت سے نکلا ہے جس کے اصطلاحی معنی بھی یہی ہیں۔

۸- Babe (بیب) بچہ کو کہتے ہیں۔ عربی میں جس وقت بچہ باپ باپ پکارنے لگتا ہے تو کہتے ہیں "بابا"۔ اور بُبُو آنکھ کی پتلی کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے

۹- Bad (بیڈ) بہ معنی خراب و ذلیل۔ فارسی کا بد بھی یہی ہے، لیکن آپ یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ عربی میں بادؔ کے معنے میں بھی ہلاکت و خرابی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

۱۰- Bank (بنک) بہ معنی کنارا۔ عربی میں بھی بنک بنچ یا اُٹھے ہوئے حصۂ زمین کے معنے میں مستعمل ہے۔

۱۱- Batten - Fatten (بیٹن - فیٹن) موٹا کرنا۔ اب عربی کے دو لفظ ملاحظہ کیجئے: "بَدُنَ - (موٹا ہو گیا) اور "فدّن" (موٹا کیا)

۱۲- Beat - (بیٹ) مارنا۔ عربی میں "کبت" کے معنے بھی ذلیل کرنے اور ہلاک کرنے کے ہیں۔ اُردو میں پیٹنا کی مماثلت پر بھی غور کیجئے۔

۱۳- Bigami (بائی گامی) دو شادیاں کرنا۔ اس لفظ کا دوسرا ٹکڑا عربی لفظ "جمع" سے ماخوذ ملتا ہے "Bi" بہ معنی دو اور گامی بہ معنی جمع یہ دو بیویوں کو جمع کرنا۔

۱۴- Blank (بلینک) = صاف و سادہ۔ Bleach (بلیچ) صاف کرنا، سفید کرنا۔ Blanch (بلینچ) سفید کرنا = ان الفاظ کے ساتھ عربی کے لفظ بلق اور بلج کو ملاحظہ کیجئے، بلق کے معنے ہیں "صاف ہونا، ظاہر ہو جانا" اور بلق اس وقت کہیں گے جب سیاہ میں سفید رنگ مل جائے۔ ابلق اسی سے مشتق ہے۔
عربی و انگریزی الفاظ کی مماثلت پر غور کیجئے۔

۱۵- Booze (بوس) باڑا جس میں جانور بند کئے جاتے ہیں اسی کے ساتھ عربی لفظ حبس پر غور کیجئے جس کے معنے بند کرنے یا قید کرنے کے ہیں۔

۱۶- Borax (نوسادر) کو کہتے ہیں جو عربی لفظ بورق کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

۱۷- Borough (تلفظ بُرُو) فصیل دار شہر یا قلعہ کو کہتے ہیں۔ عربی میں لفظ برج کو ملاحظہ کیجئے جو اس کے ہم معنی ہے[1]۔

۱۸- Bottle (باٹل) بوتل۔ اول اول بوتل چرمی تھیلے کو کہتے تھے جو پھولا رہتا تھا، اس لئے ہو سکتا ہے کہ یہ عربی لفظ بطّ سے نکلا ہو جس کی شکل بالکل چرمی تھیلے کی سی ہوتی ہے۔

۱۹- Break (برک) بحالت اسم اس کے معنے ٹھہراؤ، وقفہ اور انقطاع کے ہوتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ عربی لفظ فرق کی بگڑی ہوئی صورت ہو۔

۲۰- Brigade (بریگیڈ) فوج کا ایک حصہ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ عربی لفظ فریق سے لیا گیا ہو اور اسپینی زبان کی وساطت سے یورپ میں رائج ہوا ہو چونکہ اسپین میں مسلمانوں کی حکومت عرصہ تک رہی ہے اس لئے وہاں کی زبان میں عربی کے بہت سے الفاظ کا پتہ چلتا ہے۔

۲۱- Bud (بڈ) کلی یا کونپل کو کہتے ہوں جو حال ہی میں اُگی یا پھوٹی ہو۔ عربی میں "نبت" کا استعمال بھی اسی معنی میں ہوتا ہے اور نبت و بڈ میں مماثلت ظاہر ہے۔

۲۲- Buss (بس) بوسہ دینا۔ عربی میں باس کے معنے بھی یہی ہیں اور بس و باس میں کوئی فرق نہیں۔

۲۳- Calamus (کلمس) ڈنٹھل، ڈنڈی یا نرکل کے ٹکڑے کو کہتے ہیں اور عربی کا قلم بھی بالکل یہی چیز ہے۔

۲۴- Calamity (کلیمٹی) ہر سخت مصیبت و تباہی کو کہتے ہیں۔ عربی میں کلم کے معنے جراحت پہونچانے کے ہیں اور ان دونوں کی مماثلت ظاہر ہے

۲۵- Callous (کیلو) جس کے پر و بال نہ ہوں، بے سر و سامان۔ عربی میں لفظ کلّ کا استعمال بھی یتیم، غریب، کمزور اور ناکارہ کے مفہوم میں ہوتا ہے۔

---

[1] اس سلسلہ میں اس حقیقت کا اظہار غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مغرب کی دوسری زبانوں میں یہی لفظ مختلف صورتوں سے پایا جاتا ہے، مثلاً Bourg - Burg Borg وغیرہ اور ہر جگہ قلعہ بندی کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے جیسے Hamburg اور Edinburgh اس لئے معلوم ہوا کہ Borough, Borgo, Polis, Pole پور - پوری اور برج سب کا ماخذ ایک ہی ہے۔ ہندوستان میں بھی بہت سے شہروں کا نام جو فصیل رکھتے تھے پور یا پوری پر ختم ہوتا ہے، جیسے سلطانپور۔ رام پور، فتحپور اور مغربی زبان میں بھی بعض قلعہ بند شہروں کا نام Polis پر ختم ہوتا ہے جیسے Constantinople - Trichinopoli Tripoli

۲۶- Camel کیمل) بہ معنی "اونٹ" عربی لفظ جمل کی دوسری صورت ہے۔

۲۷- Can (کین) انگریزی کا مشہور لفظ ہے جو امدادی فعل کی حیثیت سے ہر فعل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور جس کا ترجمہ عام طور پر "سکنا" بتایا جاتا ہے عربی میں لفظ "کان" بھی امدادی فعل ہے اور اس کا محل استعمال بھی انگریزی لفظ " Can " سے بہت ملتا جلتا ہے۔

۲۸- Cat (کیٹ) بلی کو کہتے ہیں۔ عربی میں بھی قط کا لفظ نر بلی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۲۹ Cave (کیو) غار یا ہر اس حصۂ زمین کو جو کھود کر غار کی طرح بنا لیا جائے عربی میں اس سے مماثل قاب ہے جس کے معنے کھودنے کے ہیں۔

۳۰ Chafe (چیف) کاٹنا۔ عربی میں "جیف" بمعنی بھی کاٹنے کے ہیں اور دونوں کی مماثلت ظاہر ہے۔

۳۱ Chark (چارک) جلانا۔ عربی میں لفظ "حرق" جس کے معنے جلانے کے ہیں اس سے کس قدر ملتا جلتا ہے [illegible] کے جلانے کو بھی جلانا کہتے ہیں

۳۲- Check (چک) روکنا۔ ملامت کرنا، دو تحریروں میں مقابلہ کرنا۔ عربی میں لفظ "شک" کے معانی پر غور کیجئے: چبھونا، ڈنک مارنا، دھکا دینا، شبہ کرنا۔ ان تمام معانی پر چک کا لفظ حاوی ہے۔

۳۳- Chemise (شمیز)۔ اندر کا کپڑا یا ملبوس جو بنیان کی طرح عورتیں پہنتی ہیں۔ اسی کے ساتھ عربی کے لفظ قمیص کو ملاحظہ کیجئے۔

۳۴- Chimney (چمنی) دُود کش، عمارت کا وہ حصہ جہاں سے دھواں باہر کی طرف جاتا ہے۔ یہ لفظ عربی لفظ "قمین" کی بگڑی ہوئی صورت ہے جس کے معنے بھٹی یا گلخن کے ہیں۔

۳۵- Chouse (چاؤس) دھوکا دینا۔ عربی میں لفظ "خاس" کے معنے بھی یہی ہیں۔

۳۶- Chronic Chronicle (کرانک۔ کرانکل) یہ دونوں عربی لفظ قرن سے لئے گئے ہیں۔

۳۷- Coffer (کافر) صندوق یا بکس۔ یہ لفظ بھی عربی قفیر سے لیا گیا ہے جس کے معنے تھیلے یا صندوق کے ہیں۔ چنانچہ شہد کے چھتے کو بھی عربی میں "قفیر النحل" کہتے ہیں۔

۳۸- Canal (کینال) نہر = عربی میں "قنات" نہر کو کہتے ہیں اور قنی کے معنے کھودنے کے ہیں۔

۳۹- Come (کم) آنا۔ لیکن اس لفظ کا استعمال انگریزی میں کھڑے ہونے یا نمایاں ہو جانے کے مفہوم میں بھی ہوتا ہے جیسے :- The corn comes. The butter comes اور ہو سکتا ہے کہ یہ عربی لفظ قام سے لیا گیا ہو۔

۴۰ Cope (کوپ) برابر ہونے کی کوشش کرنا، مقابلہ کرنا = عربی میں کافی کے معنے بدلہ دینے کے ہیں۔ "مکافات" اور "کفو" کا مادہ بھی یہی ہے اور ان سب کے مفہوم میں جو مماثلت پائی جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔

۴۱- Content (کنٹنٹ) قانع اور قناعت کرنا۔ عربی کا لفظ "قناعت" اس سے بہت مماثل ہے۔

۴۲- Copy (کاپی) نقل = عربی میں لفظ کافی اور کفو کا مفہوم بہت کچھ اس پر حاوی ہے۔

۴۳ Corban (کربان) ہر وہ چیز جو خدا کے لئے نامزد ہو۔ یہ عربی لفظ قربان کی تبدیل شدہ صورت ہے۔

۴۴- Cost (کاسٹ) قیمت، لاگت۔ عربی میں قسط کے معنے برابر تقسیم کرنے کے ہیں اور ترازو کو بھی قسط کہتے ہیں۔ چونکہ قیمت بھی برابر کا لین دین یا تقسیم مال ہے اس لئے انگریزی لفظ کاسٹ یہاں قسط سے لیا گیا ہے۔

۴۵- Cotton (کاٹن) روئی۔ عربی لفظ قطن سے لیا گیا ہے۔

۴۶- Counsel (کونسل) مشورہ کرنا، دریافت کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ عربی لفظ سوال سے لیا گیا ہو، جس کے معنے بھی پوچھنے کے ہیں۔

۴۷- Covin (کووِن) دو آدمیوں کے درمیان ایسا معاہدہ جس سے تیسرے کو نقصان پہونچے۔ عربی میں لفظ غبن اسی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے

۴۸- Cradle (کریڈل) پالنا، جھولا۔ عربی میں لحد کے معنے بھی بلا دینے کے ہیں۔

(باقی)

جسونت کنور

(۱)

شہر میں افواہیں گرم تھیں۔ محلوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ گھر گھر یہی چرچا تھا کہ پانچ پانچ، سات سات برس کے بچے غائب کئے جا رہے ہیں، بھگائے جا رہے ہیں۔ ایک کہتا کہ بیراگی دوپہر کے سناٹے میں یا سرِ شام جہاں کہیں گلی کوچے میں بچوں کو اکیلا کھیلتے دیکھتے ہیں پکڑے جاتے ہیں اور انھیں بیراگیوں اور سادھوؤں کے غول میں شامل کر لیتے ہیں۔ دوسرا کہتا کہ کٹنیاں چھوٹی ہوئی ہیں جو لڑکیوں کو پھسلا بہلا کر اپنے ساتھ لیجاتی ہیں اور کسبیوں کے ہاتھ بیچ دیتی ہیں۔ تیسرا کہتا کہ یہ سب حرکتیں گھروں کے نوکر ہی کرتے ہیں۔ جہاں کہیں بچوں کو سونے چاندی کا زیور پہنے دیکھا لے اڑے۔ بچوں کو مار ڈالا۔ زیور کے کوڑے کئے۔ غرضیکہ جتنے منھ اتنی باتیں۔ اگر کوئی ان خبروں کو بے بنیاد ثابت کرتا تو اُسے یوں قائل کیا جاتا کہ تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ میرے ایک عزیز اپنی بیوی اور بال بچوں کے ساتھ ہردوار کمبھ نہانے گئے تھے۔ بھیڑ میں ان کی سات برس کی بچی غائب ہو گئی۔ برسوں پتہ نہ چلا۔ اتفاق سے تھوڑے دن ہوئے ایک شادی کے سلسلہ میں وہ گانے والی کی حیثیت سے آئی اور پہچانی گئی۔ ماں کا سامنا ہوا، اُسے بھی کچھ یاد آیا۔ روئی، ماں کی تشفی کی۔ لیکن گھر واپس آنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا، دونوں کلیجے برسوں کے رگھیں، اُس کے گانے کے ریکارڈ بہت مشہور ہیں۔ اصلی واقعہ ہے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے، سب کہتے ہیں کہ افواہیں ہیں۔ دوسرے صاحب کہتے کہ چشم دید واقعہ ہے کہ میرے دوست کا ایک لڑکا آٹھ برس کی عمر میں گھر کے دروازے سے کھیلتے کھیلتے غائب ہو گیا مجھ سے بہت مانوس تھا۔ ہر طرح تحقیقات کی گئی لیکن پتہ نہ چلا۔ پار سال کا ذکر ہے کہ میں نے خود اُسے ایک بیراگی کے ساتھ دیکھا اور پہچانا بھی۔ گھر واپس چلنے کی بہت کوشش کی لیکن اُس بیراگی کا نہ معلوم کیا اور کیسا جادو اُس پر تھا کہ وہ کسی طرح گھر واپس چلنے کو راضی نہ ہوا آنکھوں دیکھی بات ہے میں کیسے مان لوں کہ افواہیں بے بنیاد ہوتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ گلی کوچوں میں۔ سڑکوں پر ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی ایسا ہنگامہ برپا ہو جاتا کہ جس کی بنا پر افواہیں اور گرم ہوتیں، ماؤں کے کلیجے دہلنے لگتے اور ہر صاحب اولاد غیر معلوم خطرے کے اندیشہ سے پریشان رہتا۔

ایک بڑھیا عورت قوم کی مسلمان۔ میلے کپڑے پہنے۔ کمر جھکائے لکڑی کے سہارے چلتی۔ امین آباد کی سڑک سے گزر رہی تھی۔ اُس کی جھولی میں کچھ شلغم اور ساگ تھا اور اُس کی اُنگلی پکڑے ایک چھ سات برس کی خوبصورت سی بچی جو کسی ہندو کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ روتی چلی جا رہی تھی لوگوں کو شبہ ہوا۔ دوڑ پڑے۔ پہلے دو چار نے بڑھیا سے باز پرس شروع کی۔ بڑھیا ٹرّائی تھی۔ اُلجھ پڑی۔ پھر جمِ غفیر اکٹھا ہو گیا۔ پولیس نے دست اندازی کی۔ بالآخر تحقیقات سے ثابت ہوا کہ کسی شریف ہندو گھرانے کی بچی ہے۔ اپنی کے ساتھ بازار گئی تھی۔ راستہ میں مچل گئی اور بات کا بتنگڑ ہو گیا۔

ایک دن ناکہ ہنڈولہ کی سڑک سے ایک یکہ دو سواریاں بٹھائے تیزی سے جا رہا تھا۔ ایک بوڑھے بھلے انس گیروے رنگ کا ریشمین کرتا پہنے اُس پر بیٹھے تھے اور انکی گود میں سات آٹھ برس کا ایک لڑکا تھا۔ گیروے رنگ کے کپڑے۔ بچہ کا رونا۔ اور یکہ کا تیز جانا کافی تھا۔ کچھ لوگ "دوڑو، پکڑنا" چیختے ہوئے یکہ کے پیچھے بھاگنے لگے۔ اس کیفیت نے ہیجان پیدا کیا۔ یکہ روکا گیا تو خلقت جمع ہو گئی بچے کی چھینا جھپٹی ہونے لگی۔ بالآخر پولیس نے آکر رفع دفع کیا اور بات صرف اتنی تھی کہ دادا میاں پوتے کو ساتھ لئے اسٹیشن جا رہے تھے۔ وقت تنگ تھا۔ یکہ کو دوڑایا گیا۔ بچہ خوف سے سہم گیا۔ رونے لگا۔ بس ہنگامہ برپا ہو گیا، ایسی واردا تیں آئے دن ہوتی تھیں، بات بے بنیاد ہوتی تھی لیکن خلقت کی زبانوں پر بتنگڑ ابن جاتی تھی۔

کئی برس ہوئے کہ شک و شبہ۔ وحشت و ہنگامہ کی یہ فضا تھی شہر لکھنؤ میں، جس سے عوام میں ہر وقت اندیشہ کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ایسی افواہوں کی ابتدا آگرہ سے ہوئی، پھر کانپور اور فیض آباد کی خبریں اخباروں میں شائع ہوئیں اور اب دو ماہ سے ان افواہوں نے لکھنؤ میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ کچھ اصلیت بھی تھی۔ کانپور آگرہ اور فیض آباد میں دو چار واقعے بچوں کے غائب ہو جانے کے ہو چکے تھے لیکن پولیس پتہ چلانے میں کامیاب نہیں ہوتی تھی۔ اس سب کا مجموعی اثر یہ تھا کہ بڑے بڑے شہروں میں خوف و اندیشہ سے فضا بگڑی ہوئی تھی۔ گو اس وقت تک خاص لکھنؤ میں کسی ایسے حادثہ کا پتہ نہ چلا تھا۔ تاہم سب سے زیادہ شور یہیں تھا۔

(۲)

گو شہر کی فضا بگڑی ہوئی تھی پر دُنیا کے کام کاج اور مشغلے سب ویسے ہی جاری تھے۔ منگل کا دن تھا۔ شام کا وقت۔ امین آباد پارک میں مہا بیر جی کے مندر میں آرتی ہو رہی تھی۔ مندر کے اندر اور ارد گرد ہندو عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا۔ مرد بھی کافی تھے۔ عقیدتمند خال خال اور تماشائی بہ کثرت تھے۔ علاوہ بریں پارک کی سڑکوں پر بھی بھیڑ تھی۔ مٹھائی کی دوکانیں خوب سجی تھیں۔ خریداروں کے ٹھٹ لگے تھے۔ گھنٹے۔ گھڑیال، سنکھ کے شور اور خوانچے والوں کی آوازوں سے کان پڑی بات سنائی نہ دیتی تھی، اچھا خاصہ میلا لگا ہوا تھا۔ دفعتاً کھبلی مچی کہ کسی کا بچہ غائب ہوگیا، ماں کہتی تھی کہ نوکر دوکان پر مٹھائی لینے بھیجا لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ نوکر کہتا تھا کہ مٹھائی والے نے جلدی میں پیسے اس لاپروائی سے واپس کئے کہ تمام ریزگاری نالی میں جا پڑی۔ میں بٹورنے لگا۔ اتنے میں لڑکی غائب ہوگئی۔ میلا بھر بھنڈ ہوگیا۔ چاروں طرف دوڑ بھاگ ہونے لگی۔ کسی نے کہا کہ ایک ہندو لڑکی کسی مسلمان عورت کے ساتھ لاٹوش روڈ پر جاتے دیکھی گئی ہے، لڑکی رو رہی تھی۔ لڑکی کے ماں باپ اور بھائی سب اُدھر ہی دوڑے۔ خلقت نے بھی پیچھا کیا۔ عورت اور لڑکی دکھائی دی۔ بھیڑ اُس پر ٹوٹ پڑی وہ لڑکی کو گھسیٹتی ہوئی بیرونی خندق میں گھس گئی لیکن بچ نہ سکی۔ لڑکی کو تو باپ نے اُٹھا کر ماں کی گود میں ڈالا اور اُدھر خلقت عورت کے پیچھے پڑ گئی۔ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اُس کی چھیچھالیدر کر دی، قریب تھا کہ اُس کے گوشت پوست اور ہڈی پسلی کے تکے تکے کر دئے جائیں کہ پولیس آگئی لوگوں کو سمجھایا بجھایا، لڑکی کے رشتہ داروں کا نام پتہ پوچھا اور عورت کو حراست میں لے کر تھانہ روانہ کیا۔ خلقت لوٹی تو ایسی مسرور و مست گویا بڑا گڑھ جیتا، کوئی سنگین مورچہ فتح کیا۔ دوسرے روز گھر گھر اسی کا چرچا تھا۔ ایک کہتا تھا کہ عورت نے اقبال کیا ہے۔ بہت بڑی سازش ہے۔ اس میں نہ معلوم کس کس شہر کے اور کتنے لوگ شامل ہیں مقدمہ کی پیروی کے لئے دور دور سے وکیل اور بیرسٹر آرہے ہیں، دوسرا کہتا کہ جی نہیں وہ محض ایک کٹنی ہے۔ اُس کا یہی پیشہ ہے اس دفعہ دھر لی گئی۔ سزا ہو جائے گی۔ البتہ سزا سخت ہونی چاہئے۔ غرضکہ مقدمہ کی تاریخ کا بیچینی سے انتظار تھا۔ دو چار روز بعد جب تاریخ مقررہ آئی تو خلقت سٹی مجسٹریٹ کی عدالت پر اُمنڈ پڑی۔ باہر ہزاروں کا مجمع تھا ہر طبقہ اور فرقہ کے لوگ جمع تھے۔ پولیس کا انتظام تھا۔ جن صاحب کی لڑکی کو غائب کرنے کی کوشش کی گئی تھی وہ ایک کھتری تعلقہ دار تھے اس لئے علاوہ اوروں کے کئی تعلقہ دار بھی عدالت میں ازراہ ہمدردی موجود تھے۔ ٹھیک ۱۰ ½ بجے عدالت کی کارروائی شروع ہوئی۔ کورٹ انسپکٹر نے مقدمہ کی نوعیت بیان کی۔ شہادت پیش کی۔ گواہوں کے بیان ہوئے اور عدالت نے ملزمہ کی طرف جو کٹہرے میں کھڑی تھی رُخ کیا اور پوچھا:۔

"تمھیں کیا کہنا ہے"

ملزمہ:۔ "میں اپنی صفائی پیش کروں گی۔ البتہ میرا بیان کسی قدر طویل ہوگا امید کہ عدالت جو کچھ کہوں گی سننے کو طیار ہوگی"

عدالت:۔ "تمھیں اختیار ہے۔ جو کچھ بھی کہو گی عدالت سنے گی"

ملزمہ کی عمر تقریباً چالیس اکتالیس سال کی ہوگی۔ لانبا قد۔ گٹھا ہوا بدن۔ گورا تو نہیں لیکن رنگ اُجلا تھا، کتابی چہرہ۔ چوڑی پیشانی۔ ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں۔ جن کی پتلیاں نیلی تھیں۔ چکنے رخسار، بھرے ہوئے ہونٹ۔ سڈول گردن۔ بدن پر سُرخ گلبدن کا تنگ مہری کا پائجامہ، باریک ململ کا کُرتہ اُس پر بنیلا ریشم کا شلوکہ سر پر پیازی رنگ کی ادھی کا دوپٹہ اور پاؤں میں سرخ مخمل کی زیر پائی۔ شباب ڈھل چکا تھا اور "کاروان عمر رفتہ" نے جا بجا اپنے "نشان" چھوڑ دئے تھے۔ اُس کے ریشم سے ملائم بالوں کا رنگ اب کھچڑی ہوگیا تھا۔ چہرے پر بجائے سرخی جھلکنے کے زردی سی چھائی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھوں کے حلقوں اور ہونٹوں کے قریب کچھ جھائیاں سی تھیں جن سے جھریوں کا شبہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کے خداداد حُسن کی کشش میں ابھی تک کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ آنکھوں کی وہ چمک اور اُس کا شوخ انداز جو روزِ ازل سے آج تک مرد کو عورت کا گرویدہ بنائے ہوئے ہے۔ ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم جس سے سنف نازک ہمیشہ سخت سے سخت دل کو موم کر دیتی ہے، آج بھی اپنا کام کر رہا تھا۔ مگر اس مجمع میں یہاں ہر شخص اُس کے خون کا پیاسا ہو کر آیا تھا۔ اُس کے جادو کا کا اقرار کرنے والے تو کم تھے۔ لیکن اُس کی چڑھی ہوئی چتون۔ تنی ہوئی گردن۔ متین لہجہ اور اُس کی شخصیت کا رعب ہر شخص پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ جسوقت اُس نے اس مجمع پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالکر عدالت کو مخاطب کیا اور زبان کھولی تو کسی میں دم مارنے کی تاب نہ تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام مجمع کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ملزمہ نے اپنا بیان یوں شروع کیا:۔

(۳)

عرصہ ہوا میں اپنے ناز برداروں اور خریداروں کے حلقے میں "ملکہ" کے نام سے مشہور تھی۔ اب کئی سال سے لوگ مجھے 'وحیدن' کہکر پکارتے ہیں۔ مگر میں ذات کی ٹھکرانی ہوں، اور میرا نام جسونت کنور ہے۔ میں بڑے گھرانے کی بیٹی ہوں، میرے باپ ریاست قرولی کے جاگیردار تھے۔ میری ماں مجھے چار برس کا چھوڑ کر مرگئی۔ میرے باپ نے شادی کر لی لیکن مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ زمانہ کی افتاد سے دولت و ثروت نے اب ہم سے مُنہ موڑ لیا تھا لیکن آن بان پہلی ہی سی تھی

میرے باپ چاہتے تھے کہ مجھے کسی بڑے امیر گھرانے میں بیاہیں لیکن یہ بات آسان نہ تھی اس لئے میری شادی بدیر ۱۶ برس کی عمر میں ہوئی۔ میرے شوہر ریاست بھرت پور کے ایک جاگیر دار تھے۔ روپیہ اور دولت کی کمی نہیں تھی لیکن میں سوا سال کی تھی اور وہ پینتالیس کے۔ میرے باپ کی مرضی تھی، شادی ہوگئی اور میں آرام سے رہنے لگی۔ میرے دیور دیورانی اور دوسرے رشتہ دار سب ہی میری خاطر کرتے تھے۔ مجھے لڑکے کا بڑا ارمان تھا لیکن پانچ برس تک کوئی بچہ نہ ہوا۔ چھٹے سال میرے شوہر قضا کر گئے میں اُس وقت ۲۲ سال کی تھی۔ رنج تو ہوا لیکن شباب کا زمانہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ میں اُسے چند مہینوں میں بھول گئی۔ میرے دیور بلھدر سنگھ جن کی عمر تقریباً ۳۵ سال کی ہوگی خوشرو جوان تھے یوں تو وہ پہلے ہی سے اچھی طرح پیش آتے تھے لیکن میرے شوہر کے مرنے کے بعد سے اُن کی توجہ اور بڑھتی گئی۔ ان کے دو بچے تھے ایک چھ سات برس کا لڑکا اور دوسرے ۴ یا ۵ برس کی بچی۔ مجھے یہ بہت پیارے معلوم ہوتے تھے اور میں ان کے ساتھ اپنا بہت سا وقت صرف کرتی اور ان کو پیار کیا کرتی تھی۔ اسی بہانہ سے بلھدر سنگھ کا وقت رفتہ رفتہ میرے ساتھ زیادہ گزرنے لگا۔ میری دیورانی کو یہ ناگوار گزرتا۔ پہلے تو میں کچھ سمجھی نہیں لیکن رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آیا کہ بلھدر سنگھ کا اور میرا جب سامنا ہوتا تھا تو ان کی نگاہوں کا انداز اور ان کی بات چیت کا لہجہ طلبگار کا سا ہوتا تھا۔ میں تنہائی میں اُکتایا کرتی تھی پھر جوانی دیوانی تو ہوتی ہی ہے۔ مرد کے کہنے سننے میں آگئی۔ اب گھر والوں کا برتاؤ میرے ساتھ بدلنے لگا۔ بات بات پر طعن تشنیع اور چپقلش ہوتی تھی۔ مگر چونکہ بلھدر سنگھ میری ناز برداری خوشی خوشی کرتے تھے میں کسی کی پروا نہ کرتی تھی۔ جب کچھ اور آثار نمایاں ہوئے تب بھی میں بلھدر سنگھ کی باتوں میں آکر اس کے خمیازے سے لاپروا رہی بلکہ اپنے بچہ کے خیال سے خوش خوش رہتی۔ رفتہ رفتہ میرے کانوں میں یہ آواز آنے لگی کہ ٹھاکروں کی پنچایت ہوگی۔ مجھے برادری سے خارج کیا جائے گا۔ میں گھر سے نکالی جاؤں گی۔ یہ سنکر میرے کان کھڑے ہوئے۔ اُسی کے ساتھ بلھدر سنگھ بھی مجھ سے اب کچھ دور دور رہنے لگے اور میں ان کو معمول سے زیادہ خاموش دیکھتی تھی ایک دن بلھدر سنگھ نے آکر اور کچھ منہ بنا کر مجھ سے کہا کہ کچھ دنوں کے لئے اپنے میکے چلی جاؤ۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا اور میں نے صاف انکار کر دیا۔ اُس روز سے اُن کے تیور چڑھ گئے اور اب میری آنکھیں کھلیں۔ تاہم میری ہمت جوان تھی۔ البتہ بچہ ہونے کا زمانہ قریب ہونے اور اپنی ذات کے نازک ہونے سے میری طبیعت گری رہتی تھی اُس پر گھر میں ہر روز کچھ نہ کچھ چپقلش۔ میرا مزاج بھی چڑچڑا ہونے لگا۔ ایک دن سرِ شام بلھدر سنگھ کا لڑکا میرے پاس بیٹھا ہوا کسی بات پر ضد کر رہا تھا۔ میں منع کرتی تھی کہ دفعتاً مچل گیا۔ میں نے ڈانٹا وہ روتا چیختا ماں کے پاس چلا گیا وہ رسوئی میں تھی سمجھی کہ میں نے مارا۔ وہاں سے غیظ و غضب کی حالت میں بُرا بھلا کہتی چولھے کی لکڑی اُٹھا میری طرف دوڑی اور مجھے مارا۔ میں لکڑی کی چوٹ سے سہم کر رونے لگی۔ اتنے میں بلھدر سنگھ آئے اور یہ کہکر کہ "کس کے منہ لگتی ہو" بیوی کو میرے کمرے سے باہر لے گئے۔ لکڑی کی چوٹ سے مجھے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی کہ جس قدر اُن کے اس فقرے سے ہوئی۔ جیسے تیور چڑھا کر اور جس لہجہ میں انھوں نے یہ فقرہ کہا تھا اُسنے میرے دل میں اور بھی ٹھیس لگائی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب تھک کر شل ہوگئی تو بے حس ہو کر پڑ گئی۔ گھنٹہ بھر بعد ہی مجھے دردِ زہ کی تکلیف شروع ہوگئی اور میں کرب کی حالت میں پڑی لوٹتی رہی۔ دو گھنٹے اور گزرے۔ میری پُرانی نوکرنی میرے پاس تھی۔ مجبور ہو کر میں نے اُسے بلھدر سنگھ کو بلانے بھیجا۔ وہ اپنے پلنگ پر تھے آنے میں دیر لگی اتنے میں بچہ ہو پڑا — جب بلھدر سنگھ آئے تو جھنجلائے ہوئے تھے۔ بچہ رو رہا تھا۔ انھوں نے کرخت لہجہ میں پوچھا:-

بلھدر سنگھ : کیا ہے ؟ - کیا ہوا ؟

میں : لڑکی ہوئی ؟

بلھدر سنگھ : اس کا رونا بند کراؤ - کیا فضیحت کراؤ گی -

اتنے میں بلھدر سنگھ کی بیوی بہن سامنے آکھڑی ہوئیں - بچہ اور زیادہ رونے لگا -

بلھدر سنگھ : مجھے دو - میں اسے کہیں دفع کروں -

میں : یہ نہیں ہو سکتا -

بلھدر سنگھ کی بیوی : کھڑے دیکھتے کیا ہو، کمبخت کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے

بلھدر سنگھ : کھیل ہوگیا - بس اسے میرے حوالہ کرو

یہ کہکر وہ میری طرف بڑھے، میرے جسم میں گویا آگ سی لگ گئی تھی۔ وحشت اور جنون میرے سر پر سوار تھا۔ میں نے تقریباً چیخ کر کہا - خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا ہوگا یہ کہکر میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور پیچھے ہٹ گئی۔ بلھدر سنگھ کی بیوی نے ایک حقارت کی نگاہ سے ہم دونوں کو دیکھا اور یہ کہکر "اچھا جاؤ اب ملائیں منہ تکا کرو" میرے

کمرے سے باہر چلی گئی۔ بلبھدر سنگھ تاؤ میں آکر میری طرف بڑھے۔ میں نے اُنھیں زور سے دھکا دیا وہ لڑکھڑائے اور دیوار سے جا کر ٹکرائے۔ میں موقع پا کر لڑکی کو چمٹائے دروازے سے باہر نکل گئی۔ آدھی رات کا وقت ہوگا سب سوئے پڑے تھے۔ میں گلی کوچوں اور سڑک پر بے اختیار بھاگ رہی تھی۔ بلبھدر سنگھ غصہ میں بھرے کچھ بڑبڑاتے بُرا بھلا کہتے میرا پیچھا کر رہے تھے۔ جب میں چار فرلانگ کے بعد میں بیدم ہو کر گر پڑی تو انھوں نے آکر مجھے پیچھے سے دبوچ لیا۔ اور لڑکی کو میری گود سے چھیننا۔ مجھے اور تو کچھ بن نہ پڑا میں نے اُن کی کلائی پر اپنے دانت گڑا دئے۔ ایک دفع چیخ تو اُٹھے لیکن دوسرے ہاتھ سے لڑکی کا گلا گھونٹ دیا۔ ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور میری آنکھوں کے سامنے میری بچی کی جان نکل گئی۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ دم پھول رہا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ مجھے بڑی زور سے چھاتی پر گھونسا لگا۔ میں گری اور بیہوش ہو گئی — جب مجھے ہوش آیا تو تڑکا تھا۔ میں کھیت کی مینڈ پر خستہ حال پڑی تھی۔ اور ایک لانبے قد کا بوڑھا جس کی سفید ڈاڑھی اس کی ناف تک پہونچتی تھی اور ایک سفید تہمد باندھے۔ گھٹنے سے نیچا سفید کرتا پہنے۔ اور ہاتھ میں موٹا سا سونٹا لئے اپنے کمنڈل میں سے پانی لے کر میرے منہ میں ڈال رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو اس زندگی کے فرشتے کو سامنے دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ اُس نے میرا نام پتہ اور حال پوچھا میں نے صرف اتنا بتایا کہ میں ایک بیکس عورت ہوں جسے گھر والوں نے زدوکوب کر کے گھر سے نکال دیا ہے اور اب میرا کوئی نہیں۔ اس سائیں بابا نے مجھے تسلی دی اور اپنے جھونپڑے میں لے گیا۔ میں وہیں خستہ حال دن بھر پڑی رہی۔ اُس نے مجھسے پوچھا:۔ "تو بیٹی اب کیا ارادہ ہے کہاں جاؤ گی"

میں : "مجھے تو آپ ہی کا سہارا ہے۔ جہاں کہو گے چلی جاؤں گی

سائیں : "اگر تم مسلمان ہونے پر راضی ہو تو کسی بھلے مانس سے تمہارا نکاح پڑھوا کر ٹھکانہ کر دیں۔ اچھی اور خوش رہو گی"

میں : "مجھے انکار نہیں"۔

دوسرے روز وہی سائیں بابا مجھے سہارا دیکر کسی طرح آگرہ لے گئے۔ اور وہاں ایک سرائے میں ٹکائی گئی۔ دوسرے روز ایک مولوی صاحب ایک حکیم صاحب کو ساتھ لئے ہوئے سائیں جی کے ہمراہ وہاں آئے۔ مولوی صاحب نے تو مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا اور حکیم صاحب نے علاج کی فکر کی۔ تین۔ دو تک میں خراب و خستہ سرائے میں پڑی رہی۔ مجھے اپنے تن بدن کا کچھ ہوش نہ تھا۔ میرے منہ میں ناج کا ایک دانہ بھی نہیں گیا تھا مجھے اپنی تکلیفوں کا بھی احساس نہ تھا نہ بھوک پیاس ہی کا کچھ ہوش۔ البتہ میرا دماغ اپنا کام کر رہا تھا۔ جب سوچتے سوچتے تھک جاتی تو آنکھ لگ جاتی جب جاگتی تو پھر سوچنے لگتی۔ تین روز بعد جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میری تو کایا ہی پلٹ ہو گئی۔ مجھے فین روز پیشتر والی جسونت کنور اور اپنے میں زمین اور آسمان کا فرق معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کے راز کا پردہ میری آنکھوں سے اُٹھ گیا تھا۔ دُنیا کس کو کہتے ہیں میں اب سمجھنے لگی تھی شباب کا رومان۔ حُسن کی لطافتیں اور نزاکتیں۔ محبت کے راز و نیاز۔ شائستگی کے تکلفات اب میری نگاہ میں محض ڈھکوسلا معلوم ہوتے تھے۔ میں اب ان سے دھوکہ کھانے کو طیار نہ تھی۔ دریا دلی۔ دردمندی اور رحم میرے خیال میں ایسی کمزوریاں تھیں کہ جن سے انسان بعض اوقات مجبور تو ہو جاتا ہے لیکن ان سے ہمیشہ اذیت ہی اُٹھاتا ہے، اب میں سمجھنے لگی تھی کہ زندگی کی کٹھن دلچسپ منزل طے کرنے میں انسانی فطرت کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ صرف دو تین باتیں کارآمد ہوتی ہیں۔ اول خود غرضی۔ دوسرے ہمت و حوصلہ۔ تیسرے قدرتی انصاف کا احساس۔ زندگی کے حقیقت حال کا یہ سبق جو شخص یاد نہیں رکھ سکتا وہ اس دُنیا کی کشاکش میں کبھی اپنے قدم ثابت جائے نہیں رہ سکتا۔ اس لئے میں نے طے کر لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اور کیا نہ کرنا چاہئے۔ تین روز بعد جب میں نے غسل صحت کیا تو میں تین باتوں کا عہد کر کے اُٹھی۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جب تک میرا بل بوتا اور ہمت کام دے گی ان ٹھاکروں کی ذات بلکہ تمام ہندو قوم کو نیچا دکھانے اور ٹھکرانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھوں گی۔ دوسرے جس طرح میری جوانی و زندگی برباد ہوئی میں ان کی بہو بیٹیوں کی زندگیاں تباہ کر کے چھوڑوں گی تیسرے مرد کی ذات سے مجھے اب کچھ ایسی نفرت اور چڑ ہو گئی تھی کہ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں ان سے کسی قسم کے التفات کا رشتہ جوڑ کر اب ان کی پابند نہ ہوں گی انصاف میرے کانوں میں پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اُٹھ اور زندگی کا مقصد پورا کر انھیں کے سہارے میں کمربستہ اُٹھ کھڑی ہوتی۔ ہمت میری جوان تھی۔ شباب میرا رفیق تھا۔ حسن میری پونجی تھی۔ یوں تو میں تن تنہا تھی لیکن مجھے کسی کا ڈر نہ تھا۔ مولوی صاحب نے کلمہ پڑھاتے ہی میرے اوپر ڈورے ڈالنے شروع کئے، نکاح کا پیغام بھی دیا، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ سائیں بابا بولے کہ بیٹی تو پھر کیا کرو گی، میں نے کہا کہ طوائف کا پیشہ۔ صوفی منش آدمی تھے۔ پہلے تو کچھ دیر سوچے، پھر مسکرا کر کہنے لگے کہ جیسی تمہاری مرضی۔ جو کچھ مدد ہو سکے گی کروں گا۔ ایک ہفتہ کے اندر میں کوٹھے پر بیٹھ گئی اور شہر میں میرا چرچا ہونے لگا۔

مجسٹریٹ : "واہ تو ہندوؤں میں بھی تقریباً ہر شہر میں ایسے آشرم کھل گئے ہیں جہاں بیوہ۔ بیکس اور مظلوم عورتوں کی خبر گیری کی جاتی ہے اور ان کی زندگی بہتر بنانے اور ٹھکانے لگانے کی تدبیریں کیجاتی ہیں تو پھر تم نے اسلام کیوں قبول کیا۔ کیا تمھیں اس پر عقیدہ تھا۔

ملزمہ : جی نہیں۔ میں تو ہر مذہب کو خواہ ہندو ہو یا اسلام سوسائٹی کا محض ایک ڈھکوسلا سمجھتی ہوں۔ مجھے کسی مذہب پر کوئی عقیدہ نہیں۔ علاوہ اسکے یہ آشرم نہیں بلکہ بدمعاشوں اور اُٹھائی گیروں کے اڈے ہیں جہاں بیکس عورتیں بھگا کر لے جائی جاتی ہیں اور پنجابیوں کے ہاتھوں بیچی جاتی ہیں ان میں سے جو بعض شرافت کا دم بھرتے ہیں وہاں ان عورتوں کی شادی کر دیجاتی ہے اور معاوضہ میں آشرم کے چندے کے بہانہ سے نقد دام لئے جاتے ہیں۔ عورت ذات کی کسی کو پروا نہیں یہاں تو ہندوؤں کی مردم شماری گھٹنے نہ پائے صرف اس کی کوشش ہے۔ میں وہاں کیا کرنے اور کیوں جاتی ؟

مجسٹریٹ : تو مولوی صاحب کے ساتھ نکاح ہی کر لیتیں۔ اس سے تو بہتر تھا۔

ملزمہ : ہاں بہتر ہوگا لیکن اس کی حالت بھی یہ تھی کہ گھر میں دو عورتیں بٹھائے تھا۔ تیسری پر ڈورے ڈال رہا تھا اور قبر میں جانے سے پیشتر چوتھی کا ارمان رکھتا تھا۔ میں اپنے تئیں اُس کا تختۂ مشق بنا کر عورت کی ذات کی توہین کیوں کرتی ؟ مجسٹریٹ صاحب شاید آپ کو میرا یہ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات معلوم ہوتی ہوگی اور جو کچھ میں کہونگی وہ بھی انوکھا معلوم ہوگا۔ مگر اصلیت یہ ہے کہ عورت کی ذات میں طوائف ہی وہ جنس ہے کہ جسنے مردوں کی ظالم قوم سے مقابلہ کرنے میں اپنی ذات کی شان کو گرنے نہ دی اور عورتوں کی ہستی کا پلڑا بھاری رکھا ورنہ یہ گھر کی بیٹھنے والی گھر والیاں تو اپنی عصمت و حرمت ہمیشہ بڑے سستے داموں بیچتی رہتی ہیں۔ میں تو یہ خیال کرتے ہی شرم سے گڑ جاتی ہوں خیر اب میری داستان سنئے :۔ عرصہ ہوا آگرہ میں مُنّی جان نامے ایک طوائف تھی جس کا شمار اپنے زمانہ کی مشہور گانے والیوں میں تھا۔ صاحب دولت تھی اور اونچے درجے کی، اور معقول میں شمار کیجاتی تھی۔ اب بڑھیا ہو چلی تھی۔ محفل اور مجروں میں بہت کم جاتی تھی۔ خدا بھلا کرے سائیں بابا کا اُنھوں نے مجھے اُس تک پہونچایا۔ نہ معلوم میری کونسی بات اُسے پسند آئی۔ مجھے اپنے یہاں رکھ لیا اور بیٹی کی طرح سمجھنے لگی۔ اُٹھنے بیٹھنے کا شعور۔ بات چیت کرنے کا سلیقہ۔ شعر و سخن کا ذوق اور پڑھنے لکھنے کا مشغلہ میں نے اُسی کی صحبت میں حاصل کیا۔ یہ تو آسان تھا لیکن ناچنے گانے کی تعلیم سچ کہتی ہوں کہ لوہے کے چنے چبانے سے کم نہ تھی۔ دو برس میں اس کی بھی مہارت حاصل کر لی۔ میں نے کیا سیکھا اور مجھے کیا آیا اس کا اندازہ تو مجھے کبھی ٹھیک ٹھیک ہوا نہیں۔ لیکن مجروں اور محفلوں میں میرا رنگ جمنے لگا۔ غالباً میری آواز میں کشش تھی تین ہی چار برس میں میری قدر و قیمت بڑھنے لگی اور میرا نام چمکنے لگا۔ اس طرح میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا اس عرصہ میں منی جان قضا کر گئی تھیں اور ان کی وارث میں سمجھی جاتی تھی۔ کچھ تو منی جان کے رشتہ کے طفیل میں کچھ اپنے بھی طور طریقوں کی بدولت میرا مرتبہ شہر کی طوائفوں میں سب سے اونچا تھا۔ میرے یہاں ہر کس و ناکس کا گزر ممکن نہیں تھا۔ میں بڑی بڑی محفلوں اور مجروں ہی میں جاتی تھی۔ یوں تو اکثر رئیس زادے اور نواب زادے گانا سننے کے شوقین میرے یہاں آیا کرتے تھے۔ لیکن اپنے ناز برداروں میں زیادہ تر راجپوت۔ ٹھاکر، یا کھتری اور سیٹھ ساہوکاروں کے منچلے نوجوانوں کو منتخب کرتی تھی۔ اور جب وہ گھل ہو جاتے تو آنکھیں پھیر لیتی اور بیدردی سے ٹھکرا دیتی۔ جو حیادار ہوتے یا تو زہر کھا کے سو جاتے یا شہر چھوڑ کر چلے جاتے۔ بھیا جو تیاں چٹخاتے گلی کوچوں میں چیتھڑے لگائے پھرا کرتے۔ جب مجھے یہ خبریں ملتیں تو مجھے ایسی دلی مسرت ہوتی کہ میں باغ باغ ہو جاتی۔ میرا دوسرا مشغلہ یہ بھی تھا اور اس میں مجھے سب سے زیادہ لطف آتا تھا کہ اونچے ہندو گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو کٹنیوں کے ذریعہ سے آوارگی پر آمادہ کرے گھروں سے نکلواتی، اور پھر جب میں ان کو پھٹے حالوں کوچہ گردی کرتے دیکھتی تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا اور اپنی کامیابی پر خوش ہوتی۔ میری زندگی کے ۱۵ سال اسی طرح گزرے۔ دولت کا کروفر اور کمال کی شہرت اور حسن و شباب کے ناز برداروں کا خراج تحسین۔ الغرض زندگی بڑے آرام سے گزرتی تھی لیکن بلھندر سنگھ نے جس طرح میری بچی کا گلا میری آنکھوں کے سامنے گھوٹا تھا اس کی یاد مجھے نہیں بھولتی تھی تاہم انتقام کی آگ کے شعلے اب پہلے کی طرح نہیں بھڑکتے تھے۔ شاید اس لئے کہ عیش و آرام کی زندگی انسانی جذبات کی آبدار تلوار کی دھار کو کُند کر دیا کرتی ہے۔ ایک دن غسل کے بعد جب میں آئینہ کے سامنے بیٹھی اپنے سنگار میں مشغول تھی اور میری خادمہ میرے ریشم سے ملائم اور بھونرا سے کالے بالوں کو کنگھی اور برش سے آراستہ کر رہی تھی دفعتاً میرے سر پر ایک سپید بال چمک گیا اور میں اُسے دیکھتے ہی چونک گئی اور اُس روز سے میں یہ اکثر سوچا کرتی کہ حسن و شباب کے ڈھلنے کے بعد یہ طویل زندگی کیونکر بسر ہوگی۔ ہر چند میرا اثاثہ اتنا تھا کہ میری زندگی اچھی طرح کٹ جاتی لیکن میں نے سوچا کیوں نہ موسیقی میں کمال حاصل کرنے کی طرف توجہ کروں، اس خیال سے میری تسکین ہوئی اور میں نے اب اپنا وقت اور دھیان اس طرف دینا شروع کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ اتفاق سے میری زندگی کا ایک اور ورق پلٹا۔ میری ہی کٹنیوں میں سے ایک کٹنی جو کمبخت کام چور اور اُسی کے ساتھ بے وقوف بھی تھی، ایک دن کسی اچھے گھرانے کی دس گیارہ برس کی بچی کو کسی طرح بہلا پھسلا کر گھر سے نکال لائی اور اُسے کسی طوائف کے ہاتھوں بیچ دیا۔ سوء اتفاق وہ کوتوال شہر کے کسی قریبی رشتہ دار کی بچی تھی۔ پولیس نے جان توڑ کوشش کی پہلے تو کمبخت اُس کٹنی کو گرفتار کیا۔ اور میں بھی اس میں پھنس گئی۔ مقدمہ ہوا اور مجھے بھی دو برس کی سزا ہو گئی۔ اور جیل خانہ میں میری زندگی کا تیسرا اور آخری دور شروع ہوا۔

میرے جیل جانے پر تمام بنا بنایا کارخانہ دم زدن میں ملیامیٹ ہوگیا اور میں مصیبت و عسرت کے دن جیل میں کاٹنے لگی۔ محل کی رہنے والی، جو پھولوں کی سیج پر سوتی ہو۔ جسکے دسترخوان پر دُنیا کی نعمتیں سجائی جاتی ہوں۔ جس کے ہر اشارۂ ابرو پر بیسیوں نازبردار اور خادم کٹ پتلیوں کی طرح ناچتے ہوں اُس کو اگر چشم زدن میں جیل کی زندگی کا سامنا ہو کہ جہاں نان جویں کے لئے بھی ذلیل ترین مخلوق کا محتاج ہونا پڑے، تو اُس کا کیا حال ہوگا آپ مشکل سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ جسمانی اذیتوں کے علاوہ جن کا برداشت کرنا آسان کام نہ تھا جیل کی فضا میں مجھے روحانی کوفت بھی تھی۔ میری سی گنہگار وہاں بہت سی تھیں جو میری آؤ بھگت کرنے کو طیار تھیں لیکن کچھ ایسا اجتناب تھا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ مجھے ان کی ہوا بھی لگے۔ سوائے دماغ کے پرپنچے اور دھجیاں اُڑنے کے صبح سے شام اور شام سے صبح تک میرا کوئی دوسرا شغل نہ تھا۔ بیٹھے بیٹھے سوچا کرتی۔ جب سوچتے سوچتے تھک جاتی تو سو جاتی۔ جاگتی تو پھر سوچنے لگتی۔ زندگی کے اُتار اور چڑھاؤ کے مختلف دوروں اور ہر دور کے یادگار حادثوں کی تصویریں نگاہ کے سامنے آتیں اور جاتیں۔ ان حادثوں کی ایک ایک بات بعض اوقات ایک ایک فقرہ کی یاد گھنٹوں ستاتی اور میں سر دُھنا کرتی۔ اسی دماغی کوفت اور ہیجان کی کیفیت میں یہ بات میرے ذہن نشین ہوتی کہ عورت کی ذات کی وہ زندگی اور ہستی کہ جس کو ہندو سماج نے اُس کے لئے تخلیق کیا ہے وہ مقدر ہے کہ مٹائے نہیں مٹایا جا سکتا۔ قدرتی جذبات و احساسات دبا کر پست کئے جا سکتے ہیں۔ ہم اپنی فطرت و بشریت اگر چاہیں تو بدل سکتے ہیں۔ قدرت کا قانون بھی توڑا جا سکتا ہے۔ لیکن ہندو عورت اپنے اس مقدر سے انحراف نہیں کر سکتی یہ اٹل ہے۔ اس کے خلاف سرکشی اور بغاوت ایسی ہی عبث ہے جیسے پتھر سے سر پھوڑنا۔ اس کی سیکڑوں مثالیں میری نظر سے پہلے بھی گزر چکی تھیں اور بیسیوں اس وقت جیل میں بھی میرے سامنے موجود تھیں۔ اپنی تباہی و بربادی کا حادثہ بھی میرے لئے کم سبق آموز نہ تھا۔ پر نہ معلوم میری ساخت ہی میں کوئی صورت ایسی خرابی کی تھی یا میرا خمیر ہی کچھ ایسے بغاوت کے عنصر سے گوندھا گیا تھا کہ میں اس مقدر کے آگے سر تسلیم خم کرنے کو طیار نہ تھی۔ جسوقت مجھے وہ لمحہ یاد آتا تھا اور اب کوئی دن ایسا خالی نہ جاتا کہ مجھے اس لمحہ کی یاد نہ ستاتی ہو، جب بلھدر سنگھ نے میری نوزائیدہ بچی کو میرے ہاتھ سے چھین کر اُس کا گلا دبایا اور وہ ننھی سی جان سسکیاں بھر کر میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ گئی تو انتقام کی آگ میرے تن بدن میں از سر نو بھڑکنے لگتی قدرت کے انصاف کا احساس میری سرکشی اور بغاوت کو اُبھارتا اور بھڑکاتا۔ بلھدر سنگھ کا وہ فقرہ جو اُس نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ "تم کس کے مُنھ لگتی ہو" میری ہمت و حوصلے کو جگاتا اور میں چاہتی کہ کسی طرح پر لگا کر اُڑ جاتی۔ بلھدر سنگھ کی حویلی پر پہونچتی۔ رات کے سناٹے میں اندھیرے میں، چور کی طرح دبے پاؤں اندر گھستی۔ بے خبر سوتے ہوئے بچوں کو گود میں اُٹھاتی بلھدر سنگھ کو ایک ٹھوکر مار کر جگاتی اور پیشتر اس کے کہ وہ گھبرا کر اُٹھے۔ ان ہاتھوں سے انھیں اُنگلیوں سے اس کے بچے کا گلا اُس کی آنکھوں کے سامنے دبا دیتی اور اسی امید پر میں زندہ تھی۔ اب میری رہائی کا زمانہ قریب آرہا تھا۔ میں خوش خوش اُس دن کا انتظار کر رہی تھی۔ بالآخر وہ دن آیا اور میں جیل کے باہر آئی۔ لیکن باہر نکل کر معلوم ہوا کہ میرا کوئی یار و مددگار نہیں۔ کیا کرتی تیسرے ہی دن ایک خوبصورت سی کم عمر بچی کو جو گھر کے دروازے پر کھیل رہی تھی اُٹھا کر ایک طوائف کے ہاتھ بیچ دیا۔ کچھ دام ہاتھ آئے تو تن بدن کی فکر کی۔ فطرتی بات ہے کہ جب انسان تھکا ماندہ ہوتا ہے تو جسم تھوڑا آرام چاہتا ہے۔ جیل سے نکل کر میں ذرا سا آرام چاہتی تھی، ابھی کچھ دن آزادی کی تازی ہوا میں رہنا چاہتی تھی۔ بس اتنی ہی غفلت ہوئی اور مجھے یہ دن پھر دیکھنا پڑا کہ آج عدالت کے سامنے کٹہرے میں کھڑی ہوں۔

(ملزمہ چند لمحے رُکی اور اس نے ایک لمبی سانس بھری۔ پھر عدالت سے مخاطب ہو کر بولی)

میں جانتی ہوں کہ سزا سے نہیں بچ سکتی، لیکن اس سے پہلے بس اتنی مہلت چاہتی ہوں کہ بلھدر سنگھ کی حویلی تک پہونچکر اپنا کام کر آؤں اس کے بعد یقین مانئے وہاں سے سیدھی یہیں واپس آؤں گی، بھاگ کر کہاں جا سکتی ہوں۔

مجسٹریٹ نے کہا کہ عدالت تمہیں کس اجازت دے سکتی ہے کہ تم ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کرو۔ اور اسے دو سال قید کا حکم سُنا دیا۔

ملزمہ نے یہ حکم سُنکر کہا کہ میں تو پہلے ہی سمجھتی تھی کہ مردوں کی عدالت کے سامنے عورت ذات کے دُکھ درد کا دُکھڑا رونا عبث ہے۔ یہ کہکر پہلے کٹہرہ پر اس نے دونوں باہیں رکھیں اور پھر سر نیچا کر کے مُنھ چھپا لیا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر سر اونچا کیا اور بولی کہ "بہتر ہے دو برس اور سہی، اس کے بعد تو شاید آپ سے پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

کشن پرشاد کول

اُردو کی ایک شرمناک مثنوی

"خواب و خیال"

یہ مثنوی خواجہ سید محمد میر اثر کی تصنیف ہے۔ اثر خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ دونوں بھائی بہت بڑے درویش گزرے ہیں اور ان کے مریدوں کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ خواجہ میر درد کا نام آج تک ان کے دلگیر اور جانگداز کلام کے باعث زندہ ہے اور غالباً جب تک اُردو شاعری زندہ رہے گی فراموش نہ کیا جائے گا۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ چھوٹے بھائی بھی اپنے زمانہ کے کافی مشہور شاعر تھے۔ مگر اب ان کا کلام نایاب ہے۔ جناب عبدالحق نے بمشکل تمام ان کی مثنوی کے دو نسخے بہم پہونچائے اور ایک چھوٹے سے مقدمہ کے ساتھ اس مثنوی کو انجمن ترقی اُردو نے ۱۹۲۶ء میں شایع کیا۔ (مثنوی شایع کرنے کے بعد دیوان بھی دستیاب ہوگیا اور وہ بھی شایع ہوچکا ہے) مصنف کے متعلق علامہ عبدالحق تحریر فرماتے ہیں کہ "میر اثر کا کلام بہت ہی پاک صاف اور فصیح ہے اور درد اور اثر کی چاشنی رکھتا ہے اور مثنوی تو سلاست وفصاحت کی کان ہے ---- جدید اُردو زبان کی جب سے بنیاد پڑی ہے شاید ہی کوئی مثنوی زبان کی سلاست اور روانی، فصاحت اور شیرینی روزمرہ کی صفائی قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی زنانے اور مردانے محاوروں کے بے تکلف استعمال میں مثنوی "خواب وخیال" کا مقابلہ کرسکتی ہے"

یہ عبارت پڑھکر میں نے اس مثنوی کا بڑے شوق کے ساتھ مطالعہ شروع کیا لیکن جس قدر پڑھتا جاتا تھا شوق کم اور مایوسی زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ اس مایوسی کی وجہ شاید ایک جملہ یا سطر میں بیان کرنی مصلحت نہ ہوگی۔ جبکہ علامہ عبدالحق اس کی تعریف ایسے پرزور الفاظ میں کرچکے ہیں۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی پر خصوصاً تبصرہ کیا جائے تاکہ اس کے عیوب (اور خوبیاں اگر کچھ ہوں) واضح کئے جاسکیں۔

مثنوی لکھنے کا سبب و غرض ۲۶۱ اشعار بطور دیباچہ کے لکھے گئے ہیں۔ جس میں یہ بتایا ہے کہ یہ واردات محض خیالی ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ میر درد نے مثنوی کے طور پر تسو اشعار کہے تھے میر اثر نے بھائی سے مانگ کر اور ان کے دو سو اور اشعار فارسی اور اُردو کے لیکر (جو مثنوی میں جابجا شامل کئے ہیں) باقی تقریباً تین ہزار اشعار خود "روانی اور نوجوانیِ طبع" کو آزمانے کے لئے کہے۔ مگر بے توجہی سے ہنستے ہنستے چند دن میں کہکر پھینک دئے دوست احباب نے انھیں یاد کرلیا مگر مصنف نے داخل دیوان نہ کیا۔ گو یہ شعر سنجیدگی سے نہیں کہے گئے مگر پھر بھی مصنف کو دعویٰ ہے کہ :-

ہاں مگر جو کوئی کہ شاعر ہو	فنِ شعری میں آپ ماہر ہو
یا جو کوئی کہ یار صادق ہوں	بے تکلف بدل موافق ہوں
عالم دوستی سے ہو کے خبر	رکھتے ہوں گے دلوں میں درد اثر
لطف سب بات کا وہ پادیں گے	جی میں خطرا برا نہ لادیں گے

ہیرو - یہ مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ ایک شخص ہے جو اپنا حال نہیں بتاتا کہ اس پر کیا گزری ہے مگر اس کی حالت یہ ہے کہ آہ وزاری کرتا رہتا ہے --- اسکی نیند اور بھوک غائب ہے۔ ٹھنڈی سانس بھرتا ہے۔ آہ وفغاں کرتا ہے۔ زار زار روتا ہے اور ڈاڑھیں بھی مارتا ہے۔ بے حواس اُداس من مارے اور جی ہارے رہتا ہے۔ اس کی حالت ماہی بے آب کی سی ہے۔ اس قدر سوکھ گیا ہے کہ دق کا مریض یا کسی پر عاشق معلوم ہوتا ہے۔ ایسا بھی گمان ہوتا ہے کہ اس کو جنون یا سودا یا دماغی خلل ہے یا کوئی مجذوب یا مستانہ ہے۔ وہ نہ کسی سے بولتا ہے نہ ہنستا ہے۔ اس سے حال پوچھا جائے تو روتا اور خفیف ہوتا ہے لیکن بغیر پوچھے آپ ہی آپ بکتا ہے اور جب کچھ پوچھتے ہیں تو منھ تکنے لگتا ہے کسی کے بہلائے نہ بہلتا ہے نہ دوستوں کی غمگساری اس کے کام آتی ہے۔ البتہ اس کی زبان پر اس قسم کے شعر

ایک تو اس کے جور نے مارا	اور یاروں کے غور نے مارا
آہ یارب کدھر نکل جاؤں،	دوست دشمن کو منھ نہ دکھلاؤں

رہتے ہیں۔ لوگ جتنی اس کی خیر خواہی کرتے ہیں وہ اتنا ہی "مرتا ہے" لوگوں سے وہ اس طرح بھاگتا ہے جیسے وحشی۔ رات دن اس کو جاگتے گزرتی ہے۔ بیقراری کی یہ کیفیت ہے کہ جان نکلی جاتی ہے۔ جہاں بیٹھ جاتا ہے وہاں سے چلتا ہے نہ پھرتا (بے قراری میں شاید میر اثر کے زمانہ میں ایسا ہی ہوتا ہوگا) دیوار کی طرف بیمار کی طرح منہ کئے بیٹھا رہتا ہے اور کبھی کبھی مردوں کی طرح پڑ جاتا ہے مگر کبھی چلنے پر آتا ہے تو کہیں اک آن نہیں ٹھہرتا۔ البتہ چلتا ہے کہیں اور دھیان ہوتا ہے کہیں۔ نہ کسی کی نصیحت انتا ہے نہ اپنا بُرا بھلا پہچانتا ہے۔ کچھ فارسی کے اشعار بھی اسے یاد ہیں جن میں سے دو شعر شاعر کو یاد رہ گئے،

گاہ یارم بمن نمی سازد — آہ یارم بمن نمی سازد
ناصحاں راز من چہ می سازد — خواہ یارم بمن نمی سازد

وہ غم کھا کے اور آنسو پیکے جیتا ہے۔ اس کی تباہ حالی ایسی ہے کہ نہ کہیں دیکھی اور نہ سُنی۔ لوگوں سے اس کی تباہ حالی دیکھی نہیں جاتی کیونکہ دیکھ کر خود اپنا حال تباہ ہونے لگتا ہے۔ اس کے پاس جانے اور آنکھ ملانے کی بھلا کسے مجال۔ اس کا خیال کر کے ہی خوف خدا آتا ہے۔ اس کا حال سُنکر لوگ سر دھننے لگتے ہیں۔ اس کی زبان سے کوئی مربوط بات ہی نہیں نکلتی۔ مجذوب کی سی بڑ مارتا رہتا ہے۔ گل کی طرح جیب اور سینہ پھاڑے اور بلبل کی طرح "دھاڑے ہے" مگر بعد مدت کے

آتش عشق میں ہوا جو گداز — دلِ عاشق نے تب یہ کھولا راز
شمع کی طرح رو کے پھوٹ پڑا — یہ خدا جانے سچ کہ جھوٹ کہا

قصہ: اس کے بعد وہ اپنا حال پہلے ایک غزل فارسی کی پھر ایک غزل اُردو کی پڑھکر فارسی میں یوں شروع کرتا ہے:

اے کہ می پرسی از حقیقتِ من — کشف عالم بود ز صورتِ من
دوستاں سخت حالتے دارم — کہ بدستِ بتے گرفتارم
نہ مرا طاقتِ جدائی او — نے مرا تابِ خود نمائی او
ہجر و وصلش بہ من نمی سازد — دل باظہار آں چہ پردازد
لیک دائم خراب احوالی است — گر در آغوش جائے او خالیست
من بہ او مائل او است مائل من — تیرہ بختی شد است حائل من،

بس اتنا سا قصہ ہے کہ جس معشوق سے اُلفت ہوگئی تھی اب اس سے آغوش خالی ہے اس شخص کی مجنونانہ حالت شاعر نے کم و بیش ستر اسی اشعار میں ظاہر کی ہے، اور جن سے پتہ چلتا ہے کہ ..... ہر وقت نالہ و بکا۔ کبھی کبھی داڑھیں مار کر رونا۔ راتوں نہ سونا۔ جہاں بیٹھ جانا وہاں سے نہ اُٹھنا۔ چلدیا تو اک آن نہ رُکنا۔ لوگوں کو دیکھ کر وحشیوں کی طرح بھاگنا۔ مجذوب کی طرح بڑ مارنی، حال پوچھا جائے تو یا رونے لگنا یا منہ تکنا اور بے پوچھے آپ ہی آپ بکنا کبھی اُردو کے اشعار کبھی فارسی کے اشعار پڑھنا۔ دوستوں کو بُرا بھلا کہنا اپنے بُرے بھلے کو نہ سمجھنا۔ لوگوں کا اس کے پاس جانے بلکہ آنکھ ملانے سے خائف ہونا اور اس کا حال تباہ دیکھ کر خوف خدا کھانا۔ اس کا کوئی مربوط بات نہ کہنا۔ نہ کچھ کھانا نہ پینا۔ بے حواس اور اُداس رہنا۔ صورت سے دق کا مریض معلوم ہونا۔ جیب و سینہ کو گل کی طرح چاک کرنا اور بلبل کی طرح "دھاڑنا" الغرض یہ تھا اس کا حال .....

..... ایسے دیوانہ اور مجنونِ کامل سے اس زندگی مستعار میں امید نہ تھی کہ کبھی کوئی مربوط بات کہنے کے قابل ہوگا، مگر یہ میر اثر کا اعجاز ہے کہ انھوں نے اس کی زبان سے ایک دو کلمے نہیں تقریباً ڈھائی تین ہزار شعر فارسی اور اُردو میں کہلوائے!

یاد ایام عشرتِ فانی — پوچھنے والوں کو اپنے عشق۔ وصل اور ہجر کی داستان تقریباً سوا شعار میں بتا کر عاشق خیال یار سے فارسی میں یوں مخاطب ہوتا ہے

اے پریروئے بے وفا دلدار — دے جفا جوئے بے مروت یار
کاش روئے ترا نمی دیدم — تا کہ چندیں بلا نمی دیدم
دیدہ یکبار خود تماشا کرد — لیک دل را خراب و رسوا کرد
یک نظر را نمودی و رفتی — پردہ از رخ کشودی و رفتی

دیدہ بودم زدور یک دو نگاہ، غیر ازیں نیست ہیچ جرم و گناہ
از ہماں روز طالعم برگشت برسرِ من گزشت انچہ گزشت

ان اشعار کو پڑھکر یہ قطعی واضح ہو جاتا ہے کہ ایک بار دیکھنے کے بعد معشوق کا دیدار نصیب نہ ہوا اور یہ قصہ ان حادثات میں سے ہے جو Love at first sight کہلاتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایک دو نگاہ دیکھنے کے بعد پھر معشوق سے ملاقات نہ ہوئی۔ مگر چوٹ ایسی کاری لگی تھی کہ ہوش و حواس قایم نہ رہے اور ایک مدت تک مجنونانہ کیفیت طاری رہی۔ یہاں یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ عاشق خود کہتا ہے کہ اس کا گناہ صرف اس قدر ہے کہ اس نے ایک دو نگاہ دیکھا ہے اس کے آگے نوبت نہیں آئی بہت جلد آپ دیکھیں گے کہ دراصل نوبت کہاں تک آچکی تھی۔

معشوق سے خیالی تخاطب صفحہ ۱۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۶۰ تک جاری رہتا ہے۔ ہر صفحہ پر ۲۵-۲۶ اشعار درج ہیں۔ اس طرح تقریباً بارہ سو اشعار میں عاشق اپنی ہجر کی کیفیت اور وصال کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ ہر بات اس قدر چبا چبا کر کہی گئی ہے کہ دل اُکتا جاتا ہے اور ہر چند کہ بیچ بیچ میں غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں جو شگفتہ اور اچھی ہیں مگر مضمون کی یک رنگی (بلکہ بے رنگی) عاجز کر دیتی ہے اور بار بار کتاب بند کر کے رکھ دینی پڑتی ہے۔ غالباً اس کا احساس مصنف کو بھی ہوا ہوگا چنانچہ یہاں سے انھوں نے مضمون میں رنگ آمیزی شروع کی ہے اور اس شدت سے کی کہ الامان الحفیظ۔

کم و بیش سوا سو اشعار شاعر نے یادِ ایام فانی تازہ کرنے پر صرف کئے ہیں۔ اوپر یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ عاشق کا گناہ صرف ایک دو نگاہ دیکھنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اس مختصر سی ملاقات میں حضرت عاشق جو کچھ کر گزرے (جس کا بیان نیچے درج کیا جاتا ہے) لائق صد ہزار آفریں ہے۔ یاد دہانی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ:-

یاد ہے جو کئے تھے قول و قرار تمہیں کیا کھائی تھیں ہزاروں بار

(یہ طرفہ ماجرا ہے کہ عاشق و معشوق صرف اتنی دیر کے لئے ملے کہ عاشق ایک دو نگاہ سے زیادہ نہ دیکھ سکا مگر قول و قرار ہزاروں بار ہوئے۔ ممکن ہے سوائے ایک یا دو بار کے جب کبھی بھی عاشق و معشوق ملے ہوں عاشق کی آنکھ پر پٹی بندھی ہو) عہد و پیمان کی یاد دہانی کی تفصیل نثر میں یہ ہے۔ آپس میں عہد و پیمان ہوتے تھے۔ دوستی کی سب رسمیں پوری ہو چکی تھیں۔ معشوق عاشق سے پوچھتا تھا کہ نباہو گے بھی یا نہیں دونوں بے انتہا "ارتباط اور گرمیِ اختلاط کرتے تھے"

ایک دم بھی جدا نہ ہوتے تھے ساتھ کھاتے تھے ساتھ سوتے تھے

محبوب خود عشق کا دم بھرتا تھا۔ کہتا تھا کہ بے وفائی کروں تو خدا موت دے۔ اپنے ایمان اور عاشق کی جان کی قسمیں کھا کھا کے اور خدا کو شاہد بنا کے محبت کا یقین دلاتا تھا اور رشتۂ محبت کو استوار کرنے کے لئے اپنا جھوٹا حلوا کھلاتا تھا۔ عاشق سے قسمیں دے دیکر پوچھتا تھا کہ کیا تم بھی اتنی ہی محبت کرتے ہو جتنی میں۔ عاشق پر کم محبت کرنے کا الزام رکھتا اور اس پر لڑتا تھا اور کہتا تھا کہ میں کیسا بدنصیب ہوں کہ ایسے سے محبت کرتا ہوں جو مجھ سے میری برابر محبت نہیں کرتا۔ باتوں سے درگزر ناز و ادا۔ عشوہ و غمزہ کا وہ عالم تھا کہ بقول شاعر

ہائے رے تیری گرمیاں وے وے سختیاں اور نرمیاں وے وے

کبھی شوخی سے گرماتا اور کبھی ڈر کے نرماتا تھا۔ کبھی ہنستے ہنستے رک جاتا تھا کبھی منہ ڈھانپ کر جھک جاتا تھا۔ کبھی تیوری چڑھا کر گھورتا تھا اور کبھی نظریں ملا کر رجھاتا تھا۔ کبھی مسکرا کر منہ پھیرتا تھا۔ کبھی دانت پیستا تھا۔ کبھی باتوں میں کھل کے گرماتا اور کبھی شرماتا تھا۔ گال پر ہاتھ رکھکر اپنی چال پر اتراتا تھا۔ سلجھانے کے بہانے بال کھول کر عاشق کا دل اُلجھا لیتا تھا۔ غرض عاشق و معشوق میں خوب نوک جھونک رہتی تھی۔ کبھی عاشق اگر جسم سے جسم ملا کر بیٹھ گیا تو اس سے معشوق کہتا کہ سنبھل کے الگ بیٹھو اور تھوڑی دیر بعد خود معشوق بے حجابانہ چمٹ جاتا تھا۔ اس طرح کے ہزاروں چوچلے ہوتے رہتے تھے۔

وہ تری چنچلائیاں ہر دم وہ تری اچپلائیاں ہر دم

اختلاط کی سرگزشت — اس کے آگے کے اشعار کی نثر کرتے کی ہمت نہیں پڑتی بہتر ہے کہ میر اثر ہی کے برگزیدہ الفاظ میں مذکر لطف اندوز ہو جئے:-

ہنس کے کہنا تیرا میرے پیارے مرد اپنی غرض کے ہیں سارے
نکلے جانا تڑپ کے ہاتھ سے دوں، ٹھہر جانا کبھی دو جوں کے توں
بات ٹھہرا کے پھر مچل جانا عین اس وقت پر پھسل جانا

باز آنا نہ زور کرنے سے — چپکے رہنا نہ شور کرنے سے
پہلے شیخی سے اور رے ہونا — بھاگ کر پھر وہیں پرے ہونا
سب دبے پر تو وعدے کر جانا — لیک وقت آنے پر مکر جانا
وقت کے وقت وہ ڈرے جانا — دشمنوں کا تیرے مرے جانا
وہ ترا دونوں ہاتھ کر کے اوٹ — میری رانوں پر رکھ بچانا چوٹ
دامن اِدھر اُدھر سے لے آنا — ڈھانپتے ڈھانپتے میں کھل جانا
ہاتھا پائی سے ہانپتے جانا — کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا
ہاتھ پاؤں کرخت کر لینا — پھر کبھو جی کو سخت کر لینا
وہ سراپا عرق عرق ہونا — اور بے اختیار ہو رونا
سانس اوپر کو پھر اُچھل جانا — بے طرح تلملا کے ہل جانا
وہ ترا روٹھ کر نہ کرنا بات — چھاتی پر مسکرا کے مارنا لات
دمبدم وہ ترا تھکے جانا — سہج کی بات میں چپکے جانا
پھیرنا وہ اِدھر اُدھر مُنھ کو — مسکرا دینا دیکھ کر منھ کو
✓ وہ ترا منھ سے منھ بھڑا دینا — وہ ترا جیب کا لڑا دینا
✓ وہ ترا پیار سے لپٹ جانا — اور دل کھول کے چمٹ جانا
دبی گھبرا کے پھر جدا ہونا — ملتے جلتے میں رک خفا ہونا
وہ ترا ریجھ کر بچا جانا — لطف کو اپنی گوں بچا جانا
کہے دینا وہ تیری چتون کا — کہ سزا ہے ہے گھاؤ دشمن کا
وہ ٹھنکنا و ماغداری سے — پھر بلکنا وہ آہ و زاری سے
ہولے ہولے پکارنے لگنا — ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگنا
منھ سے کچھ کچھ پڑے بکے جانا — چھوٹ جانے کی گوں تکے جانا
تھک کے کہنا خدا کے واسطے چھوڑ — نیند آتی ہے اب مجھے : جھنجھوڑ
منتیں سب تمام کر لینا — پاؤں پڑنا سلام کر لینا
ڈر کے مارے وہ کانپنے لگنا — مُنھ کو ہاتھوں سے ڈھانپنے لگنا

وہ ترا داشگاف ہو جانا — پھر وہ لڑ بھڑ کے صاف ہو جانا
مار پچھپو سنوار ہے یونہی — لڑنے بھڑنے میں پیار ہے یونہی
یاد ہے اپنی وہ بھی صورت — خوب لگتی تھی دلی صورت
وہ ترا ڈھیلے چھوڑنا بے بس — وہ ترا سست ہو کے کہنا بس

ناک میں بولنا وہ ماندے ہو — وہ غریبی سے کہنا دیکھو تو
بات باقی رہی نہیں ابتو — رات باقی رہی نہیں رہی ابتو
کہیں تیری یہ بات —— یا یونہی ساری رات ——
منھ میں باقی کچھ ابتو بات نہیں — صبح بھی ہو چکی ہے رات نہیں
کہیں ابتو خدا سے ڈر بس چھوڑ — ہاتھ اس سختی سے مرے نہ مروڑ
چوڑیاں دیکھ میری پھوٹی ہیں — اور گہنے تمام ٹوٹی ہیں،
اب یہ آفت کہاں کی ٹوٹ پڑی — سر سے پاؤں تلک جو لوٹ پڑی
دیکھ اب آگے مار بیٹھوں گی — یا کسی کو پکار بیٹھوں گی
آدمی ------ نکلے گی — مُنھ سے کیونکر نہ چیخ نکلے گی
تیری خاطر سے بات کرتی ہوں — جان سے اپنے ورنہ مرتی ہوں
نہیں معلوم تو ہے کون بلا — یاد رکھنا یہ اپنی بات بھلا
کبھی پھر بھی تو کام ہووے گا — دیکھیو کون ساتھ سووے گا
واہ کیا خوب محرم تن ہے — جان کا میری تو تو دشمن ہے
جی مرا دشمنی سے خیر لیا — تو نے مجھ سے کہاں کا بیر لیا
تیرے ملنے کی بس سزا ہے یہی — دوستی کرنے کا مزا ہے یہی
مرد کی ذات بے وفا ہے گی — ان کے ملنے میں سب دغا ہے گی
دیکھیں جینا کسو کا نے مرنا — ان کو اپنی ہنسی خوشی کرنا
تیرے پاؤں پڑوں ہوں جانے دے — ٹک میرے دم میں دم تو آنے دے
ہائے اللہ اب تو جان چلی — نہیں لگتی ہے کوئی بات بھلی

معشوق کے اطوار و عادات

اس ناگفتنی واردات کے یہ تفصیلی اشعار نقل کرنے کی معافی چاہتا ہوں مگر بغیر نقل کئے ایک تو مرشدنا و مولانا جناب خواجہ سید محمد میر اثر کے مشاہدات تجربات و زور بیان کا صحیح اندازہ آپ کو نہیں کرا سکتا تھا دوم اس معشوق عدیم المثال کا حال ظاہر کرنا منظور تھا ------ جس کو ایک دو نگاہ دیکھ کر عاشق پر مدتوں مجنونانہ کیفیت طاری رہی۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ شب زفاف سے تعلق نہیں رکھتا، کیونکہ شاعر ایسے واقعات کی یاد دلانا چاہتا ہے جو روزانہ کی زندگی سے وابستہ تھے اور ایسی ہستی کے ساتھ وابستہ تھے جو خود عاشقی کا دم بھرتی تھی اور مٹے محبت سے سرشار تھی۔ پھر یہ سمجھنا ذرا دشوار ہو جاتا ہے کہ "وقت کے وقت ڈرنا" کیسا "ہاتھا پائی" کیسی۔ روٹھ کر بات نہ کرنا۔ چھاتی پر لات مارنا۔ ٹھنکنا۔ بلکنا۔ آہ و زاری کرنا۔ ہولے پڑے بکنا۔ چھوٹ جانے کی کوشش کرنا۔ گلو خلاصی کے لئے منتیں کرنا اور پاؤں پڑنا۔ ڈر کے مارے کانپنا۔

رانوں پر ہاتھ رکھ کے چوٹ بچانا۔ ڈھیلے ہاتھوں سے مارنا۔ ہولے ہولے پکارنا۔ لڑنا بھڑنا۔ مار بیٹھنے اور کسی کو پکارنے کی دھمکی دینا وغیرہ وغیرہ کیا معنی۔ ایک بار کھل جانے کے بعد یہ باتیں کہاں ہوتی ہیں۔ اور اگر بفرض محال یہی مان لیا جائے کہ یہ واردات پہلی شب ہی کی ہے تو کیا پہلی شب میں لڑکیوں کا دستور یہی ہوتا ہے کہ :

وہ ترا پیار سے لپٹ جانا — اور دل کھول کے چمٹ جانا
ہولے ہولے پکارنے لگنا — ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگنا

اور ان کی زبان کیا پہلے ہی رات ایسی چلنے لگتی ہے :۔

کہیں تیری یہ بات بگڑے گی — یا یونہی ساری رات بگڑے گی
دیکھ اب آگے مار بیٹھوں گی — یا کسی کو پکار بیٹھوں گی ،
نہیں معلوم تو ہے کون بلا — یاد رکھنا یہ اپنی بات بھلا
کبھی پھر بھی تو کام ہووے گا — دیکھیو کون ساتھ سووے گا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ پہلی ملاقات کی باتیں نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے دونوں خوب گھل مل چکے ہیں۔ ایسا ہے تو یہ تمام نخرے کیسے۔ جب دونوں نشۂ محبت میں چور ہیں تو تکلفات بے جا کا گزر کیوں اور یہ حضرت عاشق کہاں کے رستم پیدا ہوئے ہیں کہ ہر روز شام سے صبح کرتے ہیں اور بس نہیں کرتے محبوبہ ہاتھ جوڑ کر اور پاؤں پڑ کر کہتی ہے کہ :

مجھ میں باقی کچھ ابتو بات نہیں — صبح بھی ہو چکی ہے رات نہیں ،
کہیں ابتو خدا سے ڈر بس چھوڑ — ہاتھ اس سختی سے مرے نہ مروڑ ،
تیرے پاؤں پڑوں ہوں جانے دے — ٹک مرے دم میں دم تو آنے دے
ہائے اللہ ابتو جان چلی ، — نہیں لگتی ہے کوئی بات بھلی
دیکھیں جینا کسو کا نے مرنا — ان کو اپنی ہنسی خوشی کرنا

مگر وہ ہیں کہ ——

ایسے قصاب کو عاشق کے لفظ سے یاد کرنا اور اس کے ذکر میں تین ہزار شعر کہنا حضرت میر اثر ہی کا کام تھا۔ خدا ان کو ان کی سعیٔ جمیل کا اجر عطا فرمائے اور اس عاشق صادق کو (جس کے عشق کی صداقت مندرجۂ بالا اشعار میں ہر لفظ پر اظہر من الشمس ہے) غریق رحمت کرے۔

محبوب کی گلفشانی

ادھر عاشق نے معشوق کے تصور سے یہ باتیں کیں ادھر الہام یا لاسلکی کے ذریعہ اس تجاہل پیشہ کو جو عاشق کو حرف غلط کی طرح بھلائے ہوئے تھا فوراً خبر ہوگئی اور وہ آگ بگولہ ہو کر یوں گلفشانی کرنے لگا :۔

یاد رکھنا بھلا تو میرے حریف — جیسا تو نے کیا ہے مجھ کو خفیف۔
خوب تو نے مجھے خراب کیا — دل جلا کر مرا کباب کیا
شرم سے مجھ کو پانی پانی کیا — بے حیائی میں اپنا ثانی کیا ،
شرم سے پاؤں تک میں آب ہوئی — سب کی نظروں میں کیا خراب ہوئی

تذکیر و تانیث کی بحث

آخری شعر سے ایک نازک بحث چھڑ جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شعرائے اُردو کا محبوب ہر چند کہ عورت ہوتی ہے مگر ان کی حیا کا تقاضا یہ ہے کہ فعل اور ضمیر وغیرہ وہی استعمال کریں جو مردوں کے لئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کا میر اثر نے بھی التزام کیا ہے مگر چونکہ تخاطب عورت سے تھا یہ التزام نبھ نہ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا محبوب کہیں مذکر ہے اور کہیں مونث۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

جب سے ہر دل تو ہو گیا ہے عزیز — ہوس و عشق کی رہی نہ تمیز
ابھی آگے تو اور جاتے گا ، — جتنا دیکھے گا اُتنا مانے گا
تو بھلی گھر میں جا کے بیٹھ رہی ، — یا تری شکل دل میں بیٹھ رہی

تو میری جان گر نہیں آتی — زیست ہوتی نظر نہیں آتی
کوئی دن رہ کے گر ملے گی تو — کفِ افسوس پھر ملے گی تو

غزلوں میں تو مذکر معشوق نبھ جاتا ہے مگر مثنوی میں جہاں عورت سے دوبدو بات کرنی ہوتی ہے۔ جہاں معشوقہ کے حالات بالتفصیل بیان کئے جاتے ہیں اور وہ خود بات کرنے میں اپنے لئے تانیث کے الفاظ استعمال کرتی ہے۔ یہ التزام بیجا نہایت نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے حسن اور شوق وغیرہ نے اس بے جا التزام کی پابندی لازم نہیں سمجھی مگر مثنوی "خواب وخیال" کے لئے یہ تذکیر وتانیث کا اجتماع کچھ زیادہ بے محل نہیں ہے۔ کیونکہ اس مثنوی میں شروع سے آخر تک سوائے بے تکے پن کے اور کچھ نہیں ہے۔ ابھی عاشق مجنون کامل ہے۔ اور ابھی ہوشمند۔ ابھی اس کا کلام بے ربط ہے اور ابھی وہ فارسی اور اُردو میں مفصل ومربوط داستان سنانے لگتا ہے۔ ابھی معشوق فرطِ اُلفت میں خوب زور سے چٹتا ہے اور ابھی دولتیاں رسید کرتا ہے اس لئے اگر میر اثر کا یہ انوکھا معشوق بہ ہزار صفات تذکیر وتانیث متصف نہ ہوتا تو تعجب کی بات تھی۔ ہاں تو محبوبہ کی گلفشانی کا ذکر تھا معلوم ہوتا ہے کہ عاشق صادق نے ہجر ووصال کے تمام تفصیلی حالات گلی گلی، کوچے کوچے مشتہر کر دئے ہیں ورنہ "سب کی نظروں میں کیا خراب ہوئی" کہنے کا کوئی محل نہ تھا۔ یہاں تک مثنوی پڑھنے سے جو احساس ہوتا تھا وہ یہ کہ مدتوں سے عاشق ومعشوق میں گفت وشنید نہیں ہے۔ عاشق نے ہجر کے صدمہ سے ایک عمر دیوانگی میں بسر کی ہے اور جب ذرا ہوش آیا ہے تو خیالی تخاطب شروع کر دیا ہے۔ مگر مندرجۂ ذیل اشعار دیکھئے کہ کیا پتہ دیتے ہیں:-

نہ رہوں پھر میں تیرے ساتھ کبھو — دیکھئو اب نہ آؤں ہاتھ کبھو
پھر ترے ساتھ اب نہ بولوں میں — بات دل کی کبھو نہ کھولوں میں
یاد رکھنا یہ اپنی باتیں سب — مجھسے ملنا تو اس طرح پھر اب
ہے تری موت بس یہی تھوڑی — آج سے میں وہ بات سب چھوڑی
ابتو ہاں ہاں کبھو نہ بات کروں — تجھسے صحبت نہ دن نہ رات کروں
تجھ کو میرا مزاج یاد نہیں — کل تو تھا یاد آج یاد نہیں

یہ اشعار صاف بتا رہے ہیں کہ ابھی تک بات چیت اور صحبت کا سلسلہ جاری ہے اور اگر منقطع بھی ہوا ہے تو ہفتہ عشرہ سے زیادہ نہیں گزرا۔ اگر مدتیں ہو چکی ہوتیں تو وہ معشوق جو پہلے ہی سے کنارہ کش ہے کنارہ کشی کی دھمکی کیوں دیتا۔

معلوم نہیں کہ محبوبہ دل کی بھڑاس نکالنے خود عاشق کے گھر آئی تھی یا خط بھیجا تھا یا قاصد۔ بہرحال عاشق تک ایک ایک لفظ پہونچا اور فوراً اس نے معذرت میں ایک پُرمغز تقریر تیار کی۔ اس کی بابت بھی مثنوی میں کچھ مذکور نہیں کہ عاشقِ نحیف وزار نے یہ تقریر خود سنائی یا نامہ بر سے بھیجی۔ اس تقریر میں عاشق معشوق سے کہتا ہے کہ میں نے تو جو کچھ کہا تھا وہ تیری تعریف میں کہا تھا نہ کہ برائی کے ضمن میں (واقعی اختلاط کے جو اشعار اوپر درج کئے گئے ہیں وہ معشوق کے رتبہ کو کس قدر بلند کر دیتے ہیں) البتہ تجھ میں ایک برائی بہت بڑی ہے وہ یہ کہ تجھے ہماری جدائی گوارہ ہے کیونکہ تیرا دل سخت پتھر ہے۔ مگر تجھی پر کیا منحصر ہے۔ تمام عورتوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

عورتوں کے بارے میں اظہارِ خیال — یہ کہکر حوا کی تمام بیٹیوں کی یوں مدح سرائی کی ہے:-

کیا کہوں عورتوں کی مضبوطی، — اور ان کے دلوں کی ثابوتی،
رغبت اپنی کبھی جتاویں نہیں — اُلفت اپنی طرف بتاویں نہیں
قصہ کوتاہ ہیں یہ سنگدلاں — دشمنِ عقل وہوش وآفتِ جاں
ان کے ہاتھوں نہ کوئی چھوٹ سکے — کچھ کریں دل نہ ان سے ٹوٹ سکے
جو یہ چاہیں انھیں دیا کیجے، — لطف جب چاہئے لیا کیجے
حوصلہ سے زیادہ پاتی رہیں، — خوب اپنے تئیں بناتی رہیں،

حد سے افزود خرچ پایا کریں — جو یہ چاہیں سو خوب کھایا کریں
نان نفقہ انھیں دیا کیجے، — خواہش ان کی جو ہو کیا کیجے
نہیں بنتی بلا دئے ان کے — پیٹ پر پیٹ لا دئے ان کے
وقت پر کیسے کام آتی ہیں، — کام یہ تو تمام آتی ہیں،

اگر نان نفقہ دیگر "لطف جب چاہئے لیا کیجے" کا مضمون تھا تو اپنی محبوبہ کی یہ داستانِ طویل رقمطراز کرنے کی کیوں نوبت آئی۔ وہ بھی عورتوں میں سے ایک عورت ہے۔ نان نفقہ دیگر خوب گلچھرے اُڑاتے ہوئے ممکن ہے "حد سے افزود خرچ" اور نان نفقہ دئے بغیر ہی عشق جاودانی کا رشتہ باندھنا چاہا ہو۔ عورتوں کی کچھ اور تعریف ملاحظہ ہو:

نہ کبھو نام لیجے ان کا — ان سے بس کام لیجے ان کا
ساری مجلس کی خوشنمائی ہیں — دیکھنے کے لئے بنائی ہیں،
دیکھ ان کو بغور بات نہ کر — ساتھ ان کے کچھ اور بات نہ کر
نہیں گفت و شنید کے قابل — صورتیں ہیں یہ دید کے قابل
بات سمجھیں نہ سمجھیں لطف کلام — دیکھئے اور کیجے ان کو سلام
ہیں سبھی بدگماں اور کج فہم — جا دے اُلٹے طرف ہی ان کا وہم
عورتوں کو ہزار ہوں قابل — شعر کا لطف انھیں نہ ہو حاصل

عورتوں کی مدح سرائی کم و بیش نوے اشعار میں کی ہے اور خوب کی ہے۔

اور دیگر کتابوں میں نظر سے گزرا ہے کہ پرانے زمانہ میں شرفاء کی مستورات نہایت سلیقہ مند۔ پڑھی لکھی اور صاحب فہم ہوتی تھیں مگر

حیاتِ جاوید میر اثر نے جو حقیقت طشت از بام کی ہے اگر واقعی حقیقت ہے اور ان کے زمانے میں سب ہی عورتیں "بدگماں" اور "کج فہم" ہوتی تھیں تو مسلمانوں کے ادبار و تنزل کے اسباب کی جستجو میں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ واقعی جس قوم کی عورتیں صاحب علم و فضل سے بات کرنیکی قابل تک نہ ہوں۔ جو نہ بات سمجھیں نہ لطف کلام۔ جن کی عقل ٹیڑھی اور گمان بد ہو اور جو سوائے ایک مخصوص کام کے کسی مصرف کی نہ ہوں اس قوم کا بیڑہ کیوں نہ غرق ہو۔ اب ہم بیچارے میر اثر کو ایسی بے تکی اور بے سراپا مثنوی لکھنے کے لئے معذور سمجھنے پر مجبور نہیں کیونکہ انھوں نے بھی ایسی ہی جاہل کج فہم کم عقل عورت کی گود میں پرورش پائی ہوگی۔ عام عورتوں کو کج فہم و بے عقل و بے مصرف بنانے کے بعد عاشق محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ گو تمام عورتیں ایسی ہوتی ہیں مگر تو تو

نکتہ رس شعر فہم تھا تو تو، — بات سمجھے تھا خوب آگو تو
اب خدا جانے کیا یہ تجھکو ہوا — بات اُلٹی طرح سمجھنے لگا

گویا جو کچھ تجھ میں پہلے تھوڑی بہت عقل تھی بھی وہ اب مفقود ہے۔ اس پیام کو پاکر محبوبہ عاشق سے بیزار و بیگانگیر ہونے کے لئے کیا کیا نہ تڑپی ہوگی۔ جب اُسے معلوم ہوا ہوگا کہ عاشق کے نزدیک عورت کی قیمت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اسے خوب کھانے پینے کو دو اور جب چاہو ان کو لطف کشی کا آلہ بناؤ تو وہ فرط شوق میں دیوانہ وار حضرت عاشق کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوئی ہوگی کہ حضرت "لائیے پیسے اور اُٹھائیے لطف"۔

سراپا مثنوی میں کوئی قصہ یا پلاٹ تو برائے نام بھی نہیں۔ جب ہجر و حسرت دید و آرزوئے وصل کے شعروں سے کتاب ضخیم نہ ہوئی ہوگی تو خیال آیا ہوگا کہ لگے ہاتھوں دو چار سو شعر معشوق کے سراپا ہی میں لکھ ڈالیں۔ اگر لکیر کا فقیر بن کر سراپا لکھا جائے تو اس سے آسان کام شاعری میں شاید ہی کچھ ہو۔ شاعری کی ابتدا سے معشوق کے دہن۔ عارض۔ کمر۔ گردن۔ قامت۔ ابرو۔ چشم۔ مژگاں۔ گیسو وغیرہ پر کثرت سے اشعار کہے جاتے رہے ہیں۔ ایک دو نہیں سیکڑوں تشبیہیں موجود ہیں جو چاہے ان کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا دے۔ البتہ اس شاعر کو ضرور غور و فکر کرنا پڑے گا جو نئی نئی تشبیہوں کا شایق ہوگا۔ سراپا لکھنے میں بعض ایسے اعضاء کا جن کا نام گفتگو میں لیتے ہوئے حجاب دامنگیر ہو، ہر چند کہ وہ اعضا تمام شعریت کا مخزن ہی کیوں نہ ہوں، ذکر نہیں کیا جاتا۔ مگر جن بند و قیود میں عوام جکڑے جاتے ہیں ان سے مخصوص اور برگزیدہ ہستیاں آزاد ہوتی ہیں جیسے کہ پیمبروں پر تعداد ازواج کی قید نہیں لگائی جاتی

چنانچہ میر اثر درویش خدا رسیدہ ہونے کے باعث عام پابندیوں سے آزاد تھے - انھوں نے سراپا میں سرین - ناف - زیر ناف کا بیان بھی اُٹھا نہیں رکھا جن چیزوں کا بیان کیا ہے وہ یہ ہیں :-

(۱) موئے سر — (۲) مانگ چوٹی — (۳) زلف — (۴) پیشانی — (۵) گوش و بناگوش — (۶) ابرو — (۷) چشم و نگاہ و سرمہ و کاجل — (۸) مژگاں — (۹) بینی — (۱۰) رخسار — (۱۱) لب و دہاں — (۱۲) دندان و مسی و پان — (۱۳) زنخ و چاہ ذقن — (۱۴) گردن — (۱۵) ساعد و بازو — (۱۶) دست و بند دست و انگشتاں و حنا و چوڑی — (۱۷) سینہ و پستاں — (۱۸) قد و قامت — (۱۹) کمر — (۲۰) ناف و زیر ناف — (۲۱) سرین — (۲۲) زانو و ساق — (۲۳) پائے و پاشنہ — (۲۴) کف پا و حنا —

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ان میں سے بہت سے اعضا ایسے ہیں جن کی توصیف صدیوں سے ہوتی چلی آرہی ہے چنانچہ ایسے اعضا کی تعریف میں میر اثر نے بیشتر پرانی ہی تشبیہوں سے کام لیا ہے لیکن مانگ و چوٹی - گوش و بناگوش - بینی - سینہ و پستاں - ناف و زیر ناف - سرین - زانوں و ساق پر غالباً زیادہ طبع آزمائی اُسوقت تک نہیں کی گئی تھی - میر اثر کے بعد مانگ و چوٹی کی تعریف میر حسن نے بھی سحر البیان میں کی ہے دونوں کے کلام کے موازنہ سے دونوں شعرا کے مراتب کا فوراً پتہ لگ جاتا ہے -

میر اثر	میر حسن
عقل رہتی نہیں نہ طبع سلیم	وہ کنگھی و چوٹی کھنچی صاف ساف
مانگ کی یاد جب کرے ہے دو نیم	کناری کا پیچھے چمکتا موباف
دل تو پہلے ہی مانگ لیتی ہے	کہوں اسکی چوٹی کا کیا رنگ ڈھنگ
جان بھی مفت مانگ لیتی ہے	کہ جوں آخری شب ہو جھمکے کا رنگ
کنگھی جب مجھ کو یاد آتی ہے	نمایاں ہو یوں روشنی سے جھلک
کیا کہوں کیا سماں دکھاتی ہے	کہ جوں ابر میں برق کی ہو چمک
مانگ موتی بھری وہ اے ہے بہار	موباف زری نے کیا ہے غضب
جیسے بگلوں کی بدلی میں ہو قطار	دیا ہے گرہ دن کو دنبال شب
کیا کہوں کیسی لمبی چوٹی ہے	نہ ہو کیونکہ چوٹی کا رتبہ بڑا
شب یلدا بھی جس سے چھوٹی ہے	کہ اک نور ہے اسکے پیچھے پڑا

میر اثر	میر حسن
دل کو ہر طرح پیچنے ہے وہ تو	گل و سنبل اس پر سے قربان ہے
بوریا باقی ہو کھجوری ہو	کہ اسکی لٹک میں عجب آن ہے
گرمی سے گر کبھو جو دکھے لپیٹ	دلے ہاتھ آتا ہے اس کا کٹھن
کیا کہوں اس کی میں لپیٹ سپیٹ	کہ ہے فی الحقیقت وہ کالے کا من
تو وہ طوفان قہر ہے جوڑا	اُلٹ کر نہ دیکھے اسے ہوشیار
گانٹھ ہے بس کی زہر کا جوڑا	کہ وہ اک ستارہ ہے دنبالہ دار
کوئی جیتے ہیں اس کے مارے ہوئے	وہ پیٹ اس کی شفاف آئینہ ساں
سانپ کالا ہے کنڈلی مارے ہوئے	تس اوپر وہ چوٹی کا پڑنا وہاں
	کہوں اس کے عالم کا کیا ماجرا
	کہ جوں ہوئے دریا پہ کالی گھٹا

میر اثر کے یہاں ایک آدھ تشبیہ ہے اور وہ بھی پوچ - میر حسن کے یہاں نادر تشبیہوں کی بھرمار ہے - ان اشعار کے علاوہ اور بھی اشعار تھے جو بوجہ طوالت نہیں لکھے گئے ان کے یہاں "لپیٹ سپیٹ" کے بجائے

الٹ کے نہ دیکھے اسے ہوشیار — کہ وہ اک ستارہ ہے دنبالہ دار

ہے اور انھوں نے چوٹی اور بیٹھ کے اجتماع کو دریا پہ کالی گھٹا کی انوکھی اور دلنشین تشبیہ دیکر جو لطافت پیدا کی ہے وہ میر اثر اگر عمر خضر پاتے تو بھی نہ کر سکتے. گوش و بناگوش پر میر اثر نے صرف چار شعر لکھے ہیں در آنحالیکہ آنکھ اور دہن وغیرہ پر صفحے کے صفحے رنگ دئے ہیں کیونکہ ان کے لئے پہلے سے تشبیہات کا مواد موجود تھا. کان کی ایک تشبیہ بھی انھیں نہ سوجھی بینی کی جو دو تشبیہیں دیں ہیں ان کا کیا کہنا -

ناک — ہے یا کہ ایک طوطا ہے — چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے[1]

گھنے ایسے ترے بھڑکتے ہیں — جانور وحشی جیوں بھڑکتے ہیں

اگر کسی کی ناک اس قدر جھکی ہوئی ہو کہ معلوم دے کہ دہن میں گھسنے والی ہے تو اس سے زیادہ کریہہ المنظر ناک کیا ہوگی اور اگر جانوروں کے بھڑکنے کی طرح

[1] یہ تشبیہ ہندی شاعری میں بکثرت رائج تھی - (ادیر)

معشوق کے نتھنے پھڑکتے رہیں تو ایسے پھڑکیلے معشوق سے خدا محفوظ رکھے ۔۔۔ دانتوں کی توصیف ملاحظہ ہو:-

دانت جب مجھ کو یاد آتے ہیں — دل کلیجہ سبھی چباتے ہیں

سینہ و پستاں کا ذکر کہیں کہیں اساتذہ کے کلام میں ملتا ہے مگر عموماً ان دونوں لفظوں سے گریز کرکے "اُبھار" "جوبن" وغیرہ ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ میر اثر نے سینہ و پستاں کی تعریف میں ۳۶ اشعار سپرد قلم کئے ہیں۔ کچھ جواہر ریزے ملاحظہ ہوں:-

کون پتھر کی ذات چھاتی ہے — سختی دل تری دکھاتی ہے — گر فرشتہ ہو تو بھی ہاتھ لگائے — کہ کسو طرح ان کو ہاتھ میں لائے

دل رہے ہے ہمیشہ گھات کے بیچ — کیونکہ لاؤں انھیں میں ہات کے بیچ — ہاتھ جس کے یہ نقد ڈھیر لگے — ہاتھ اندھے کے جوں بٹیر لگے

کوئی چھلاوہ ہیں یا کہ پارہ ہیں — اور سختی میں سنگ خارا ہیں — کیا ہی خوبی سے مشت مال کرے — دل ہی جانے ترا جو حال کرے

کیا قیامت امنگ سے ہیں بھری — شیشیاں دو یہ رنگ سے ہیں بھری — شرم کے مارے پست ہو جاویں — ہاتھوں ہی ہاتھ مست ہو جاویں

اگر شرم و حیا کا پردہ بالائے طاق رکھنا ہی تھا تو عورت کی اس بے بہا زینت کو کچھ تو شاعرانہ جھلک عطا کرتے۔ کیا خوب مثالیں ہیں ایک طرف سنگ خارا اور دوسری طرف پارہ یا چھلاوہ۔ سنگ خارا اور پارہ میں جو مناسبت ہے وہی شاید میر اثر کی اس مثنوی کو حقیقی شاعری سے ہے۔ رنگ بھری شیشیوں کی تشبیہ کس قدر خوفناک ہے۔ خیال کیجئے کہ عورت کے سینے سے رنگ بھری شیشیاں لٹکتی ہوں تو ان کی دلاویزی کا کیا عالم ہوگا۔ ابتو لمبی لمبی شیشیاں رائج ہیں مگر پرانی قسم کی شیشیوں کی بھی گردنیں کافی لمبی ہوتی تھیں۔

اُردو شعرا میں شاید ہی کسی شاعر نے ناف اور زیر ناف کی توصیف میں شعر کہے ہوں یا یوں کہئے کہ کہکر شایع کئے ہوں ۔۔۔

ران پہ جھکا ران پڑتی ہے — جسم میں اور ہی جان پڑتی ہے

ایک شعر قد و قامت کے متعلق بھی پیش ہے:

بڑھ چلے بالا جو آسمان تلک — نہیں پہونچے وہ تیرے کان تلک

ایسی محبوبہ کی سرپرستی اگر وہ قامت میں توجب کیا ہے۔

مہجوری و فقیری سراپا بیان کرنے کے بعد مضامین کا ذخیرہ بالکل ختم ہوگیا مگر اس کے بعد بھی تقریباً ہزار نوسو اشعار اور درج کئے گئے ہیں۔ محبوبہ تو اپنی قدر قیمت ہو حضرت عاشق کے دل میں تھی یعنی:

نام نقد انھیں دیا کیجے — خواہش ان کی جو ہو کیا کیجے
نہیں گفت و شنید کے قابل — صورتیں ہیں نہ دید کے قابل
جو یہ چاہیں انھیں دیا کیجے — لطف جب چاہئے لیا کیجے

معلوم کرکے گھر میں جا کے بیٹھ رہی۔

تو بھلی گھر میں جا کے بیٹھ رہی — یاں تیری شکل دلمیں بیٹھ رہی

تب عاشق نے ڈھٹائی اختیار کی۔

پر تیرے در پہ میں تو آن پڑا — کوئی جاتا ہوں یہاں سے اب تو اڑا
تیرے ٹالے نہیں میں ٹلتا ہوں — آگرا ہوں سو کوئی چلتا ہوں

اور محبوبہ سے کہ جس کا نعم البدل دنیا میں نہ ملنے کے باعث ایک عمر دیوانگی میں گزاری تھی یوں خطاب کیا:۔

جب سے ہر دل تو ہوگیا ہے عزیز — ہوس و عشق کی رہی نہ تمیز
اس سے آگے یہ کاروبار نہ تھا — روز دل کا نیا شکار نہ تھا
میں ہی تھا تیری گرم بازاری — کوئی کرتا نہ تھا خریداری
دلبری کی طرح جو آئی ہاتھ — خرچ کرنے لگا ہر ایک کے ساتھ

گو اس کا صاف ذکر نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریر پر مغز پر ڈیوڑھی سے اٹھوا دیا گیا۔ کیونکہ اسی صفحے پر یہ اشعار لکھے ہیں:۔

اپنے کوچے میں پھر بھر آنے کو — منع تب کر تو اس دوانے کو
بے سبب لت ہے یہاں کے آنے کی — دور سے تجھکو دیکھ جانے کی

گو یہ ڈیوڑھی پر ڈھٹائی سے بیٹھنا نہ گلی کوچے میں چکر لگانا کارآمد ہوا۔ جب قطعاً مایوسی ہوگئی۔ تب عاشق نے "اپنے مولا کی جوگن" بننے کی ٹھہرائی

دل مرا بے حواس رہتا ہے — رات دن اور اداس رہتا ہے
لطف سے آن کے تو بیٹھے پاس، — پر مجھے اب کہاں ہیں ہوش و حواس
اس جہاں سے ہی جا چکا اب میں — تو تو روئے پہ آچکا اب میں

اس کے بعد اسی مضمون کو غزلوں میں ہی ادا کیا ہے۔ کسی مضمون کو جب تک دس بیس دفعہ چبا چبا کے نہ بیان کریں میر صاحب کو مزہ ہی نہیں آتا:۔

زیست ہوئی تجھ بن اب — مر ہی جانا بس ایک بات ہے اب
اتنے بے دید و بے شنید ہوئے — نہ توجہ نہ التفات ہے اب
ہجر کیسا وصال ہو بالفرض — کچھ ہی صورت ہو مشکلات ہے اب

آخر میں اپنے بھائی خواجہ میر درد سے عقیدتمندی کے اظہار میں بہت سے شعر کہے ہیں اور اس میں بے انتہا غلو کیا ہے:۔

مالکِ جسم و جانِ من درد است — ہمہ روح و روانِ من درد است
ہست مقبول صاحبان قبول — دلبر دلبران من درد است
نالہ و آہ اوست ہادیِ راہ — جرس کاروان من درد است
خواجہ میر محمدی درد است — دستگیر محمدی درد است
پدر من توئی و پیر توئی، — نصرم تو و خواجہ میر توئی،

غزلیات اس مثنوی میں جا بجا اُردو اور فارسی غزلیات درج کی گئی ہیں جن میں سے کچھ میر دردؔ کی ہیں اور زیادہ تر میر اثرؔ کی۔ ان غزلوں کے بہت سے اشعار اچھے اور پرکیف ہیں۔ کاش علامہ عبدالحق پوری مثنوی طبع کرنے کے بجائے صرف غزلیں ہی چھپوانے پر اکتفا کرتے۔ میر اثرؔ نے خود اس مثنوی کو اس قابل نہ سمجھا تھا کہ دیوان میں شامل کریں۔ اس مثنوی کے ساتھ غزلوں کو شایع کرنا ایسا ہے جیسا کہ کوڑا کرکٹ اور اناج کو ملا دیا جائے جس کو اگر بغیر صاف کئے کھائیں تو منہ بے مزہ ہو۔ غزلوں اور مثنوی کے اشعار میں اس قدر تفاوت کی وجہ ظاہر ہے۔ مثنوی کے کئی ہزار شعر چند دن میں بے توجہی سے کہے گئے ہیں۔ چنانچہ مصنف خود لکھتے ہیں کہ "ایک دو دن میں کہہ کے پھینک دیا"۔ جب ہزاروں اشعار صرف چند دن میں کہے جائیں گے تو وہ اُن اشعار کے مقابلہ میں جو غور و فکر و محنت سے کہے گئے ہوں ضرور حقیر ہوں گے۔ مثنوی کے اشعار میں نہ تخیل سے کام لیا گیا ہے نہ رنگینی سے۔ اختلاط اور سراپا کے بیان میں اگر شاعری سے کام لیا جاتا تو باوجود عریانی کے یہ مثنوی آرٹ کا بہترین نمونہ ہو سکتی تھی۔ مثنوی کی زبان صاف ضرور ہے مگر جب مغز ہی نہ ہو تو چھلکے کا کوئی کیا کرے۔ اس میں نہ کوئی قصہ ہے نہ واردات قلبی۔ سیکڑوں اشعار ایک ہی معنی کے ملتے چلے جاتے ہیں، جن کو پڑھکر دل اُکتا جاتا ہے اور طبیعت مکدر ہونے لگتی ہے۔ تنوع اور شگفتگی جو میر حسن کی مثنوی سحر البیان کی روح رواں ہے۔ اثرؔ کے یہاں مطلق نہیں۔ اس مثنوی کے ہزار ڈیڑھ ہزار شعر بلا دریغ و تامل قلم زد کئے جا سکتے ہیں پھر جو بچیں گے وہ زیادہ تر غزل کے اشعار ہوں گے اور دو چار سو اور۔

مثنوی کی زبان علامہ عبدالحق کو سلاست اور روانی۔ فصاحت اور شیرینی اس مثنوی میں بدرجہ اتم ملتی ہے۔ سلاست اور روانی تو ضرور ہے مگر فصاحت اور شیرینی کا تو (اگر غزلیں نظر انداز کر دی جائیں) نام و نشان بھی نہیں۔ اکثر اشعار لفظی اعتبار سے بہت سبک اور ثقیل ہیں اور بھرتی کے الفاظ بھی (اور یہ وہ۔ اب۔ پھر وغیرہ) جو مصرعہ پورا کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں بکثرت ملتے ہیں کہیں کہیں قوافی کی ٹھونس ٹھانس ہے جیسے تلبیس کے ساتھ بیس یا خندق کے ساتھ فق دق۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

میں نے تصویر تیری کھینچی ہے — اب بھی درپے ہے وقت و قابو کے — گوں بنے تو بلا سے کب چوکے
گرمی سے گر کبھو جو رکھے لپیٹ — پہلے شیخی سے اورے ہونا — بھاگ کر پھر وہیں پرے ہونا
وہاں بیاں میں قلم بھی فق دق ہے — وہ ترا ریجھ کا بچا جانا — لطف کے اپنے گوں بچا جانا
آگے اس کی زباں کے خندق ہے — دمبدم وہ ترا تھکے جانا — سہج کی بات میں چھکے جانا
سیم کے کان ہیں سرین تیرے — سانس اوپر کو پھر اُچھل جانا — بے طرح تلملا کے ہل جانا
دو وہ طوفان ہیں سرین تیرے — دل پہ رہتا ہے نت ہی الجھیڑا — یک سر مو نہیں ہے سلجھیڑا
آہ پیارے مری یہ حالت ہے — دل رہا ہے ہمیشہ گھات کے بیچ — کیونکہ لاؤں انھیں میں ہاتھ کے بیچ
زاہدا سو طرح سے کر تلبیس — لعل میں ہے کہاں یہ آب و رنگ — ہو سکے ان لبوں سے جو ہم سنگ
آگے پیچھے وہ صاف رہتی ہو — دے نکت پھیون کر نکلے پڑتے ہیں — آن کر یہاں قدم پکڑتے ہیں
جو کہ آتا ہے ان کے قابو میں، — زیست کرتا ہوں اس بھروسے پر — دانت رکھتا ہوں ان کے بوتے پر
جا پڑے ہے عجب چکا پو میں، — ہاں مگر جو کوئی کہ شاعر ہو — فن شعری میں آپ ماہر ہو
وصف تیرا میں کس طرح نہ کروں — زیست معلوم خیر پھر تو مروں،
ناک ہے یا کہ ایک طوطا ہے — چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے
کیا کہوں عورتوں کی مضبوطی — اور ان کے دلوں کی ثابوتی،

آخری شعر میں "آپ" وزن پورا کرنے کے لئے ٹھونسا گیا ہے ورنہ کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس قسم کے بہت سے اشعار جا بجا ملتے ہیں۔

لفظی رعائتیں بھی کافی ملتی ہیں :-

پوؤں جس دم کہ یاد آتے ہیں | ہاتھ ہم جان سے اُٹھاتے ہیں | گر جو عاشق کو منھ لگا دے تو | لب شیریں ذرا چکھا دے تو
اس سراپا کو یاد کر کے | اب تلک تو جیا ہوں مر مر کے | پھر تو بیچارہ اس کی لذت سے | جاں بلب ہی رہے حلاوت سے
کون پتھر کی ذات چھاتی ہے | سختی دل تیری دکھاتی ہے | دیکھے گر تیرے ہونٹ شیریں کو | کوہکن بھول جائے شیریں کو
جب لبوں کا خیال کرتا ہوں | جاں بلب آرہے ہے مرتا ہوں | حُسن خوباں کی ناک بینی ہے | سارے بکھڑے کی ناک بینی ہے

کہیں کہیں محاورے یا ضرب المثل کو نظم کرنے میں پورے شعر کا خون کر دیا ہے :

زیست کرتا ہوں اس بھروسے پر | دانت رکھتا ہوں ان کے بوسے پر
ہاتھ جس کے یہ نقد ڈھیر لگے | ہاتھ اندھے کے جوں بٹیر لگے

جہاں تک میرا خیال ہے یہ مثنوی اول درجہ کی مثنویوں میں جگہ پانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ اس میں نہ کوئی قصہ ہے نہ بیان میں شاعری۔ ہیرو کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ نہایت بھونڈی ہے اگر اس کی زبان سے قصہ بیان کرانا منظور تھا تو ابتدائے قصہ میں اُس کی دیوانگی اور خود رفتگی کے انتہائی مدارج قلمبند کئے ہوتے۔ اس مثنوی کی مثال ایسی ہے کہ ایک میانہ قد انسان کو ہر قد و قامت کے انسانوں کے کپڑے پہنا دئے جائیں ظاہر ہے کہ اس ملبوس سے یہ میانہ قد شخص کس قدر مضحکہ خیز اور بھیانک معلوم ہوگا۔ جس طرح پوشاک کے لئے یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو پہنانا منظور ہو اسی کے ناپ کی سی جائے۔ اسی طرح ایک قصہ کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ جس قسم کے افراد پیش کرنے منظور ہوں اسی قسم کی صفات بیان کی جائیں۔ مگر اس مثنوی میں اس بات کا ذرا بھی خیال نہیں کیا گیا ہے۔ عشق و ہجر کا ذکر ہے تو جتنے خیالات اچھے برے۔ خوشنما اور بھونڈے شاعر کے ذہن میں آتے گئے سب کو قلمبند کر دیا۔ اختلاط کے بیان میں، شاعر نے یہ تک نہ سوچا کہ وہ کسی ایسی لڑکی کا ذکر کر رہے ہیں جو ابھی تک ایک آغوش کے علاوہ دوسری سے آشنا نہیں یا ایسی ماہر فن کا جسے "عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں" کہیں کہیں وہ باتیں درج ہیں جو دوشیزگی کو خیرباد کہتے وقت پیش آتی ہیں اور انھیں کے ساتھ ساتھ وہ بھی جن کا مظاہرہ ایک مشاق کسبی کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ سراپا میں ہمیشہ سے شعرا انتہائی مبالغہ سے کام لیتے آئے ہیں مگر اس مبالغہ سے لطافت میں اضافہ کرنا منظور ہوتا ہے اور تا متر کوشش بھی ہوتی ہے کہ ایک نہایت دلپسند اور لطیف تصویر ذہن پر منعکس ہو جائے۔ "کوہ قاف" "سیم کے کان" "سنگ خارا" "رنگ بھری شیشیوں" میں جو مبالغہ ہے وہ ہرگز کسی لطافت کا پتہ نہیں دیتا۔ اگر اُردو کی ترقی کا دار و مدار ایسے ہی ادب لطیف پر ہے تو ہمیں اس کی ترقی کی طرف سے مایوس ہو جانا چاہئے۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کا اطلاق ان غزلوں پر نہ کیا جائے جو مثنوی میں جا بجا درج ہیں۔ غزلوں کے بارے میں میں پہلے ہی کسی مقام پر اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہوں۔

حبیب احمد صدیقی

"نگار"

جنوری فروری ۴۱ء اور جنوری فروری ۴۲ء

یہ دونوں پرچے آپ کے پاس ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو اب طلب فرمائیے یا ان میں سے کوئی ایک ہے اور دوسرا نہیں، تو دوسرا بھی منگا لیجئے، ورنہ ایک وقت آئے گا کہ مومن نمبر، ظفر نمبر، اُردو شاعری نمبر، ہندی شاعری نمبر کی طرح یہ دونوں نمبر بھی کسی قیمت پر نہ مل سکیں گے۔ ان دونوں نمبروں کی اہمیت کا اندازہ اگر آپ اسوقت نہ کریں گے تو بعد میں کریں گے، لیکن یہ وقت وہ ہوگا جب آپ انھیں حاصل نہ کر سکیں گے۔ دونوں کی قیمت تین روپیہ (علاوہ محصول) منیجر نگار

مکتوبات نیاز

قبلہ[1]: تعمیل ارشاد آپ کی کتابیں میں نے پڑھ ڈالیں، لیکن آپ کو یہ سُنکر شاید افسوس ہوگا کہ میرے خیال میں مطلقاً کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی - ہوسکتا ہے کہ بعض حضرات ان کے مطالعہ کے بعد آپ کے ہم خیال ہوگئے ہوں، مگر یہاں تو وہی کیفیت ہے

آتشے تیز ست و داماں می زنم

حیرت ہے کہ آپ نے اب تک یہی نہیں سمجھا میرا زاویۂ نگاہ کیا ہے؟ - سوال "وجود باری" کا نہیں، بلکہ اُس مخصوص تصور کا ہے جو اس کی آلہانہ شخصیت کے متعلق پیش کیا جاتا ہے - کسی ایسی قوت کا وجود تسلیم کرنا جو کائنات کے ظہور و نشو و نما کا باعث ہوئی - ضروری ہے، خواہ اس کا نام کچھ ہو، لیکن اُس قوت کو تمام اُن صفات سے متصف کرنا جو انسان کی جذباتی دنیا سے متعلق ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا

انسان نے اپنے ابتدائی دور میں بھی (جب وہ حیوانیت سے قریب تر تھا) اس قوت کو تسلیم کیا، جب اس کے ذہن نے ترقی کرکے اصلاح معاشرت کے کچھ قوانین مرتب کئے، اس وقت بھی وہ اس قوت کا معترف تھا اور اب بھی جبکہ انسان نے دنیا کے بہت سے عناصر پر قابو پالیا ہے، وہ اس قوت کا مُنکر نہیں ہے - مگر فرق یہ ہے کہ ابتدائی دور میں انسان نے اسے اپنے سے زیادہ قوی الجثہ سمجھ کر اس کے دیو پیکر بُت طیار کئے، دوسرے دور میں انسان نے اسے حد درجہ سریع الاحساس سمجھ کر اسے اپنا ہی جیسا ایک مغلوب جذبات انسان سمجھا اور اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُس قوت اور دُنیا کے کاروبار میں صرف وہ تعلق ہے جو بجلی اور بجلی سے جلنے والی مشینوں کے درمیان پایا جاتا ہے

ان تینوں ادوار میں سے فی الحال درمیانی اور موجودہ دور زیر بحث ہیں اور وہ اس طرح کہ درمیانی دور میری سمجھ میں نہیں آتا اور آخری آپ کی سمجھ سے باہر ہے - یہ تو ہوئی اصل نزاع، لیکن آپ نے کبھی یہ بھی غور کیا کہ یہ اُلجھن کیوں دور نہیں ہوتی؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اپنی اور اپنے حریف کی پوزیشن کو سمجھ لیجئے

دوسرا فریق چونکہ کاروبار حیات اور اس کے نتائج کو صرف اپنے عمل سے متعلق سمجھتا ہے اور خدا کو بیچ میں نہیں

---

[1] (ایک احمدی دوست کو)

ڈالتا، اس لئے اسے پروا نہیں: خواہ آپ خدا کو بُت سمجھیں یا انسان لیکن آپ چونکہ دُنیا و آخرت دونوں کی فلاح خدا ہی سے متعلق سمجھتے ہیں اس لئے اگر کوئی شخص اس کے خلاف کہتا ہے تو آپ کو حیرت بھی ہوتی ہے اور غصہ بھی آتا ہے (خیر، حیرت پر تو تعجب نہیں، لیکن غصہ کیوں آتا ہے، یہ بات سمجھنا مشکل ہے) بہرحال آپ کے طرزِ عمل سے یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ خدا کے تصور سے جتنا آپ کو تعلق ہے، آپ کے حریف کو نہیں اور اس لئے آپ ہی کا یہ فرض ہے کہ آپ اپنے دعوے کو ثابت کریں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ بجائے اپنا دعوے ثابت کرنے کے آپ اپنے حریف کے عقاید کو باطل ثابت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ اس میں اگر آپ کو کامیابی ہو بھی جائے تو اس سے آپ کے عقیدہ کی صحت کیونکر ثابت ہو سکتی ہے، جبکہ نزاع "ہاں اور نہیں" بلکہ صرف تعبیر و تصور کی ہے

یقیناً ہر وہ شخص جس نے نظامِ کائنات پر ذرا سا بھی غور کیا ہے، وہ کسی ایسی قوت کے تسلیم کرنے پر مجبور ہے جو وجود کائنات کا باعث ہوئی، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ کسی وقت دورِ جاہلیت میں منکرِ خدا پیدا ہوا ہو تو ہوا ہو، لیکن اب وہ آپ کو کہیں نہیں ملسکتا۔ علم و عقل کی ترقی نے کچھ اور کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن الحاد و انکار کو اس نے ضرور دُنیا سے محو کر دیا۔

یہ بات سُنکر آپ کو شاید حیرت ہوگی، لیکن اگر آپ غور کریں گے تو ماننا پڑے گا کہ جس بات کو آپ "کفر و انکار" کہتے ہیں وہ خدا کے وجود کا انکار نہیں، بلکہ آپ کی "تعبیرات" کا انکار ہے اور خدا کی ذات غالباً میری آپ کی تعبیرات سے بہت بلند واقع ہوئی ہے

آپ تو بہت وسیع مطالعہ کے انسان ہیں، آپ نے یقیناً مفکرینِ اسلام کی کتابیں دیکھی ہوں گی، پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس خاص مسئلہ میں ان کی تصانیف کا ماحصل اس کے علاوہ کچھ اور ہے کہ "ما عرفناک حق معرفتک" اور کیا آج کل کے اہلِ علم کچھ اور کہتے ہیں

فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ آپ پر ایک مابعد الطبیعاتی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اُن پر "طبیعیاتی" یعنی آپ اس دُنیا سے مایوس ہو کر دوسری دنیا کا خواب دیکھنے لگتے ہیں اور وہ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ کر بیتابانہ مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں

ختمِ نبوت کے مسئلہ میں، ایک حد تک میں آپ سے متفق ہوں، لیکن حیرت ہے کہ آپ اس سے وہ فایدہ نہیں اُٹھاتے جو اُٹھانا چاہئے۔ یعنی باوجود اس آزاد خیالی کے بھی آپ کی تنگ نظری کا یہ عالم ہے کہ اپنی جماعت کے علاوہ آپ دوسری جماعت کے لوگوں سے ملنا جانتے ہی نہیں، آپ کی مسجد الگ، آپ کی نماز الگ، بلکہ آپ کی موت و زندگی سب الگ ہے، حیرت ہے کہ وہ جماعت جو ختمِ نبوت کی قایل نہ ہو اور اصلاح و ہدایت کے سلسلہ کو منقطع نہ سمجھے، وہ دوسروں سے اس طرح کٹ کر زندگی بسر کرے کہ رشتۂ ازدواج و مصاہرت بھی اسے دوسرے مسلمانوں سے گوارا نہ ہو!

انھیں باتوں کو دیکھ کر بعض اوقات میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر نبوت کا اختتام آدم ہی پر مان لیا جاتا اور اس کے بعد دوسرے نہ آتے، تو شاید نوعِ انسانی میں یہ تفریق نہ پیدا ہوتی اور بجائے عیسوی، موسوی، محمدی ہونے کے آج سب آدمی ہوتے!

جتنے نبی دنیا میں آئے، اتنا ہی تفریق بڑھی۔ مسلمانوں نے نبوت کا دروازہ بند کرکے اس تفریق میں مزید اضافہ کا سدّباب کرنا چاہا تھا، لیکن آپ نے پھر اُسے کھولدیا۔ مسلمانوں میں سُنّی، شیعہ، خارجی پہلے ہی سے موجود تھے۔ آپ نے ان میں احمدی کا بھی اضافہ کیا اور اب شاید احمدی جماعت بھی محمودی و غیر محمودی دو حصّوں میں منقسم ہوگئی ہے، آیندہ کی خبر نہیں الغرض میری رائے میں ختم نبوت کے عقیدہ سے انحراف کرکے آپ نے نوع انسانی کی کوئی مُفید خدمت انجام نہیں دی

یہ درست ہے کہ آپ کے یہاں تنظیم اور باہمی ہمدردی بہت پائی جاتی ہے مگر اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ آپ کے یہاں کوئی عمومی اخوت، کوئی عالمگیر انسانیت بھی پائی جاتی ہے یا نہیں، آپ کہیں گے "ہاں"۔ لیکن شاید اس شرط کے ساتھ کہ پہلے دنیا آپ کے مذہب کو قبول کرلے! پھر یہ "مشروط" اخوت تو اب بھی دُنیا میں ہر جگہ رائج ہے۔ آپ نے کونسی نئی بات پیدا کی — اس باب میں بہائی طبقہ کو آپ پر زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ ہر چند "عقاید" کے جھمیلے سے وہ بھی باہر نہیں تاہم وہ اس پر زیادہ زور نہیں دیتے

حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان اپنے "مابعد الطبیعیات" کو ترک نہ کرے گا، یہ منافرت دور نہ ہوگی اور مذہب نام ہے صرف "مابعد الطبیعیات" کا۔ اہل مذاہب کہتے ہیں کہ ترک مذہب کے بعد بھی دنیا میں امن وسکون قایم نہیں ہو سکتا اور اسکے ثبوت میں وہ یوروپ کی پچھلی اور موجودہ جنگ کو پیش کرتے ہیں۔ یعنی ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر دُنیا میں مذہبی تفریق نہ ہوگی تو قومی تفریق ہوگی، خونریزی اگر مذہب کی وجہ سے نہ ہوگی، تو قومی اغراض کی وجہ سے ہوگی ——

بظاہر یہ اعتراض درست معلوم ہوتا ہے، لیکن انھوں نے شاید غور نہیں کیا کہ موجودہ قومی منافرت کی بنیاد بھی مذہب ہی ہے یوروپ کی تاریخ اُٹھاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ عیسوی مذہب کے عقیدتمندوں نے دنیا کی آبادی پہ کچھ کم ظلم نہیں کئے اور خود پروٹسٹنٹ اور کیتھولک جماعتوں میں بھی باہمد گر معمولی کشت وخون نہیں ہوا

پھر یہی قدیم مذہبی عناد تھا جس نے بعد کو "قومی تفریق" کی صورت اختیار کرلی اور یہ "اختلاف عقاید" ہی کا جھگڑا تھا جس نے اول اول فساد کا بیج بویا

اس میں شک نہیں کہ دُنیا میں قیام امن وسکون کا مسئلہ اب بڑا مشکل مسئلہ ہوگیا ہے اور اس پر غور کرنا ہر شخص کا فرض ہے، لیکن اس گتھی کو سلجھانے کی صورت شاید یہ نہیں ہے کہ ساری دُنیا احمدی ہوجائے ——

مگر —— نیازی کیوں نہ ہوجائے!

محترمہ - خط ملا اور بالکل خلاف توقع، اس لئے غیر معمولی خوشی ہوئی، لکھنؤ میں آپ کا قیام جسے آپ چھ دن کہتی ہیں اور میں اپنی نگاہ سے صرف ایک ساعت سمجھتا ہوں، یقیناً بڑی خدا ساز بات تھی — ایسی -- کہ شاید اب اس کا اعادہ ممکن نہ ہو

ہر چند بھوپال میں میرے قیام کا زمانہ زیادہ خوشگوار ماضی سے تعلق نہیں رکھتا، تاہم وہاں کی زمین میں، بعض ایسی محبوب و مقدس ہستیاں مدفون ہیں، کہ میں انھیں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اخیر شوال میں حیدرآباد جاتے وقت ایک دن کے لئے وہاں ٹھہر جاؤں — لیکن کیوں اور کس کی طلب پر ؟ — یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی

میرے متعلق بعض حضرات کے استفسار پر آپ نے یہ خوب کہا کہ "جس حقیقت سے میں خود واقف نہ ہوں، دوسروں کو کیا بتا سکتی ہوں" — کیونکہ اس سے کم از کم یہ تو معلوم ہی ہو گیا کہ

آگہی بارے کہ آگہ نیستی از ما ہنوز !

"عدم علم" کا علم بھی بڑی بات ہے۔

حضرت - وحی و الہام کے جھگڑے میں آپ اب بھی مبتلا ہیں ؟ حالانکہ کشف، وحی، الہام، سب ایک ہی چیز ہیں اور ان میں سوا اس کے کوئی فرق نہیں کہ مختلف لوگوں کی اس کیفیت کو مختلف الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی وحی انبیاء کے لئے مخصوص ہے اور کشف غیر انبیاء کے لئے الہام میں انبیاء و اولیاء دونوں مشترک ہیں - غالب کا ایک شعر یاد آگیا،

شعر غالب نبود وحی و نگوئیم و لے
تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست

(یعنی غالب کا شعر وحی تو نہیں ہے اور نہ ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں، لیکن خدا کے لئے یہ تو نہ کہو کہ وہ الہام نہیں ہے)

غالب نے وحی و الہام کے اسی فرق کو پیش نظر رکھ کر یہ شعر کہا ہے

آجکل انگریزی کا ایک لفظ بہت استعمال ہو رہا ہے جس سے آپ بھی واقف ہوں گے۔ وہ لفظ "Initiative" ہے - وحی کو Inspiration کہتے ہیں۔ آپ ان دونوں کا فرق سمجھے ؟ ان میں بالکل ارادہ و عمل کا سا تعلق ہے۔ اس لئے ہر چند وحی یا الہام، مقدم چیز ہے، لیکن کام کی بات وہی Initiative یا اقدام ہے، جس سے انبیاء کو کامیابی حاصل ہوئی

اس لئے میری رائے میں "وحی و الہام" پر غور و فکر بیکار ہے، آپ کو تو جو کچھ کرنا ہے کر ڈالئے خواہ نتیجہ کچھ ہو غار حرا کا زمانہ ختم ہو گیا ہے، لیکن بدر و حنین کا ہمیشہ باقی رہے گا - اس لئے "سر بگریبان" نہ رہئے، بلکہ آستینیں چڑھا لیجئے

عشق اگر مرد ست، مردے تاب دیدار آورد
ورنہ چوں موسیٰ بے آورد و بسیار آورد

باب الاستفسار

عربی کے ایرانی و افغانی شعراء

(جناب محمد خلیل اللہ خانصاحب - بریلی)

عربی شاعری کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کی فتوحات عجم کی طرف وسیع ہوئیں تو وہ ایرانی لٹریچر سے بھی متاثر ہوئی، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ تاثر صرف اسی حد تک تھا کہ عربی شاعری میں ایرانی انداز بیان کی جھلک پیدا ہوگئی، یا یہ کہ خود ایرانیوں اور افغانیوں میں بھی کوئی قابل ذکر شاعر عربی کا پیدا ہوا۔

اگر ایسا ہوا تو ازراہ کرم دو چار کا نام معہ مختصر حالات اور نمونۂ کلام کے سپرد قلم فرمائیے۔

(نگار) استفسار کا موضوع بہت دلچسپ ہے، لیکن افسوس ہے کہ میں خاطر خواہ اس کا تفصیلی جواب پیش نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے کافی وقت اور پوری چھان بین کی ضرورت ہے "عربی شاعری پر عجم کا اثر" خود ایک مستقل تصنیف کا محتاج ہے اور ایران و افغانستان کے عربی شعراء کا تذکرہ بھی خاص کاوش چاہتا ہے۔

میری نگاہ سے اس وقت تک کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جو صرف ان مباحث کے لئے مخصوص ہو۔ اگر آپ نے یہ استفسار اس لئے کیا ہے کہ آپ کوئی کتاب اس موضوع پر لکھ رہے ہیں تو میں آپ سے عرض کروں گا کہ اسے ضرور پورا کیجئے۔ اس وقت ابن خلکان سامنے ہے اور یہ چند نام پیش کرتا ہوں:

(۱) ابراہیم بن العباس صولی۔ یہ خاندان دراصل ترکی النسل تھا، لیکن بعد کو جرجان میں آباد ہوگیا تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس کے مورث خراسان کے تھے۔ صول اس کے دادا کا نام تھا جو یزید بن المہلب کے زمانہ میں مسلمان ہوگیا تھا۔

ابراہیم، بعد کو وزیر فضل بن سہل کا ملازم ہوگیا اور ۲۴۳ھ میں بمقام سُرّ من رأے اس نے انتقال کیا۔ شعر و شاعری کے لحاظ سے یہ بڑے مرتبہ کا شخص تھا۔ اس کے بعض اشعار جو ابن خلکان نے نقل کئے ہیں ملاحظہ ہوں:

دَنَتْ بأناسٍ عن تناءِ زیارۃً ۔۔۔ وشطّا بلیلیٰ عن دنوّ مزارہا

(قاعدہ ہے کہ کشیدگی کے بعد لوگوں سے ملئے تو اس میں کمی ہوجاتی ہے، لیکن لیلیٰ کا یہ حال ہے کہ اس سے جتنا قریب ہوجئے دوری بڑھتی جاتی ہے)

اولی البریۃ طُرّا ان تواسیہم ۔۔۔ عند السرور اللذی واساک فی الحزن

ان الکرام اذا ما اسہلوا ذکروا ۔۔۔ من کان یالفہم فی المنزل الخشن

(خوشی کے وقت تمہارے شریک ہونے والوں میں بہتر وہ ہے جو رنج کے وقت بھی تمہارا شریک ہو۔ کیونکہ اچھے لوگوں کا قاعدہ ہے کہ ہمراہ زمین پر پہونچکر وہ اپنے اُن ساتھیوں بیٹے یا کسی کو ضرور یاد کرتے ہیں جنھوں نے ناہموار اُن کا منزل میں ساتھ دیا تھا)

کسی عزیز ہستی کی وفات پر لکھتا ہے:-

كنت السواد لمقلتی — فبكی علیك الناظر
من شاء بعدك فلیمت — فعلیك كنت احاذر

تو میری آنکھ کی پتلی تھا، اور اب تجھی پر رو رہا ہوں - اب تیرے بعد جو چاہے مرجائے مجھے پروا نہیں، کیونکہ دنیا میں مجھے صرف ایک تیری ہی موت کا ڈر تھا -

تغزل کے رنگ کے دو شعر ملاحظہ ہوں :-

ونبئت لیلیٰ ارسلت بشفاعة — إلیّ فهلاّ نفس لیلی شفیعها
اكرم من لیلیٰ علیّ فبتغی، — به الجاه ام كنت امرأ لا اطیعها

(مجھے معلوم ہوا ہے کہ لیلیٰ نے کسی کو اپنا سفارشی بنا کر بھیجا ہے - حیرت ہے کہ اس نے خود اپنی سفارش کیوں نہیں کی - کیا کوئی شخص لیلیٰ سے زیادہ معزز ہے جس کی سفارش سے وہ اپنا رتبہ بڑھانا چاہتی ہے یا یہ کہ میں ایسا شخص ہوں جو اسکی بات نہ مانوں گا)

یہ شاعر بھی بہت بڑا تھا اور بڑے بڑے عربی شعراء نے اس کی شاعری کی تعریف کی ہے -

(۲) صدرالدین ابوطاہر احمد سلفۃ الاصفہانی - شافعی مذہب کا بڑا محدث تھا - جب یہ مصر پہونچا (۵۱۱ھ) تو جوق در جوق حدیث کے طلبہ اس کے پاس آکر استفادہ کرتے - معلوم ہوتا ہے کہ پھر یہیں رہ پڑا کیونکہ ۵۴۶ھ میں والی مصر نے اس کے لئے ایک مدرسۂ حدیث تعمیر کرادیا - یہ ۴۷۲ھ میں بمقام اصفہان پیدا ہوا اور ۵۷۶ھ میں بمقام اسکندریہ انتقال کیا -

یہ شاعر بھی تھا لیکن کوئی مجموعہ اس کے کلام کا دستیاب نہیں ہوا - اس کے مرنے کے بعد کاغذات میں سے جو اشعار ملے ان میں سے بعض یہ ہیں:

"جمیل و بثینہ" کے واقعات عشق و محبت عربی لٹریچر میں کافی شہرت رکھتے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر شاید ابوطاہر نے بھی کوئی نظم لکھی تھی - ذیل کے دو شعر اس وقت کے ہیں جب جمیل کے مرنے کے بعد بثینہ نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا - ابوطاہر نے بثینہ کی زبان اور اپنے قلم سے اسے یوں ظاہر کیا ہے:

وان سلوی عن جمیل لساعة — من الدهر ما جاءت ولا حان حینها
سواءٌ علینا یا جمیل بن معمر — اذا مت با ساء الحیاة ولینها

(جمیل کے مرنے کے بعد زمانہ میں سکون و تسلی کی کوئی ساعت میرے لئے باقی نہیں رہی، لیکن اے جمیل، جب تو ہی نہیں، تو پھر زندگی سختی سے گزرے یا نرمی سے، ایک ہی بات ہے)

تغزل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

قالوا نفوس الدار سکانها — وانتم عندی نفوس النفوس

(گھروں کے رہنے والوں کو لوگ گھر کی جان کہتے ہیں، مگر میرے لئے تو تم جانِ جاں ہو)

(۳) ابوالحسین احمد بن فارس رازی - رے کا باشندہ تھا اور وہیں ۳۹۰ھ میں اس نے انتقال کیا - یہ بڑا فاضل شخص تھا اور فقہ و لغت کا ماہر - بدیع الزماں ہمدانی اسی کا شاگرد تھا -

اس کے اشعار بڑے پاکیزہ ہوتے تھے - بعض ملاحظہ ہوں :

مرت بنا هیفاء مجدولة — تركیة تنمی لترك
ترنو بطرف فاتر فاتن — اضعف من حجة نحوی

(ایک ترکی نسل کی پتلی کمر والی نازنین میرے پاس سے گزری جو فتنہ انگیز نگاہوں سے دیکھتی جاتی تھی اور دلیل نحوی سے زیادہ نازک تھی) -

نحو سے مراد گرامر ہے - چونکہ نحوی یا قواعد کے دلایل زیادہ تر سماعی ہوتے ہیں اس کے لئے عقلی دلایل کے سامنے ان کی نزاکت یا کمزوری ظاہر ہے -

معلوم ہوتا ہے کہ معاش کی طرف سے یہ ہمیشہ فکر مند رہا، چنانچہ لکھتا ہے:

سقی ہمدان الغیث لستُ بقایل — سوی ذاوفی الاحشاء نار تضرم
ومالی لا اصفی الدعاء لبلدۃ — افدت بہا نسیان ماکنت اعلم
نسیت اللذی احسنتہ غیر اننی — مدین ومافی جوف بیتی درہم

(ہمدان پر خدا باران رحمت برسائے۔ اس کے سوا اور کیا کہوں کہ آنتوں میں آگ لگ رہی ہے اور میں صفائی قلب سے اس شہر کے لئے دعا کرتا ہوں جس سے مجھے یہ فایدہ ہوا کہ جو کچھ جانتا تھا سب بھول گیا۔ اب تو صرف قرض لینا یاد رہگیا ہے اور گھر میں ایک درہم بھی نہیں)

وقالوا کیف حالک قلت خیر — تقضیٰ حاجۃ وتفوت حاج
اذا ازدحمت ہموم الصدر قلنا — عسیٰ یوما یکون لہا انفراج

(لوگ پوچھتے ہیں کیا حال ہے۔ کہتا ہوں، اچھا ہے، بعض ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں اور بعض نہیں، جب سینہ پر غموں کا بوجھ زیادہ ہوجاتا ہے تو یہ کہکر تسلی کرلیتا ہوں کہ یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے)

(۴) بدیع الزمان ہمدانی — یہ ہرات کا رہنے والا تھا اور پٹھانوں کے لئے انتہائی فخر کی بات ہے کہ ان کی جماعت میں بدیع الزماں ایسا زبردست شاعر و انشا پرداز پیدا ہوا کہ عربی کے بڑے بڑے اہل زبان شعراء نے اسکی فصاحت و بلاغت کی بے انتہا تعریف کی اور نظم و نثر میں اس کا تتبع کیا۔ ۳۹۸ھ میں اس کا انتقال ہوا اور ہرات میں دفن کیا گیا۔

اس کے ایک مدحیہ قصیدے کے دو شعر سنئے:

وکاد یحکیک صوب الغیث منسکبا — لوکان طلق المحیا یمطر الذہبا
والدہر لولم یخن والشمس لونطقت — واللیث لولم یصد والبحر لوعذبا،

(اگر بارش کی جھڑی بجائے پانی کے سونا برساتی تو فیض رسانی میں وہ تیرے مماثل ہوسکتی، اسی طرح اگر زمانہ خائن نہ ہوتا، سورج گفتگو کرسکتا، شیر شکار نہ کرتا اور سمندر شیریں ہوتا تو تیرے مشابہ ہوسکتا تھا)

(۵) ابوالحسن احمد بن جعفر بن موسیٰ بن یحییٰ بن خالد برمکی۔ یہ آل برمک میں سے تھا اور بڑا جامع کمالات انسان تھا۔ ۳۲۴ھ میں اس نے وفات پائی اور واسط میں مدفون ہوا۔ شاعری میں بھی اس کا بڑا مرتبہ تھا، رنگ تغزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

فقلت لہا بخلت علیّ یقظی، — فجودی فی المنام لمستہام
فقالت لی وصرت تنام ایضًا — وتطمع ان ازورک فی المنام

میں نے اس سے کہا کہ تو بیداری میں تو مجھ سے ملتی نہیں، کبھی خواب ہی میں دیدار کا موقعہ دے۔ یہ سُنکر وہ بولی کہ کیا تو کبھی سو بھی جاتا ہے اور پھر اسپر یہ تمنا بھی رکھتا ہے کہ میں خواب میں آکر تجھ سے ملوں!

(۶) صاحب ابوالقاسم اسماعیل طالقانی — بویہ خاندان میں پہلے مویدالدولہ کا وزیر رہا پھر ابوالفتح علی بن ابی الفضل کا۔ بڑا فاضل و فاضل نواز انسان تھا۔

عربی لغت کا اتنا بڑا ماہر تھا کہ اس نے ایک لغت المحیط سات جلدوں میں مرتب کیا۔ علاوہ لغت کے وہ دیگر فنون کا بھی ماہر تھا اور ادب و انشاء میں بھی خاص مرتبہ رکھتا تھا اور نزاکت خیال و بداعت اسلوب کے لحاظ سے اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ شراب کے ذکر میں اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:-

رق الزجاج ورقت الخمر — وتشابہا فتشاکل الامر
فکانما خمر ولا قدح — وکانما قدح ولا خمر

(یعنی ساغر اور شراب دونوں اس قدر صاف و شفاف ہیں کہ کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ شراب ہے شیشہ نہیں اور کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ شیشہ ہے اور شراب نہیں)

یہ ۳۴۱ھ میں پیدا ہوا اور ۳۸۷ھ میں مرگیا۔

افسوس ہے کہ قلت وقت کی وجہ سے میں ابن خلکان کا بھی پورا استقصاء نہیں کرسکا۔ آپ خود جستجو کیجئے اور علاوہ ابن خلکان کے الاغانی، عقد الفرید، مروج الذہب، طبری، ابن اثیر وغیرہ تاریخ و تذکرہ کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔ کام آسان نہیں ہے اور برسوں کی محنت چاہتا ہے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قایم کی ہوئی واحد جہازران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن اور پورٹ سوڈان، جدّہ اور سویز تک جہازوں کی روانگی کا

معقول انتظام

سفری اور بار برداری کے جہازات بمبئی اور کراچی سے عدن۔ پورٹ۔ سوڈان۔ جدّہ اور سویز تک مسافر اور مال و اسباب لیجاتے ہیں، نیز بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی اور ماریشس تک سفر کرتے ہیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کیجا سکتی ہیں

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے:۔ ٹرنر مارلیسن۔ اینڈ کمپنی لمیٹیڈ ۱۶ بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

وقت کی باتیں

جہنم میں ریل ریگزار افریقہ روئے زمین کا وہ حصّہ ہے جسے دنیا کی جہنم کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اس جگہ آفتاب کی جبروت و جلال کا یہ عالم ہے کہ سایہ میں بھی پارہ ۱۳۰ درجہ تک چڑھا رہتا ہے، لیکن آپ یہ سنکر حیرت کریں گے کہ اس جہنم میں بھی اب ریل کی پٹریاں بچھائی جا رہی ہیں۔

اس ریلوے لائن سے مقصود یہ ہے کہ شمالی افریقہ کو فرانس کے افریقی مقبوضات سے ملا دیا جائے۔ اس کا طول ۲۲۰۰ میل ہے اور اسوقت ہزاروں لوگ جو ہٹلر کے مقبوضاتِ یوروپ سے بھاگ کر یہاں پناہ گزیں ہوئے ہیں، اس لائن پر کام کر رہے ہیں۔

سرکاری طور پر یہ ریلوے فرانس کی ہے اور وشی حکومت نے پانچ ارب فرانک اس کی تعمیر کے لئے منظور کئے ہیں، لیکن درحقیقت یہ سب کچھ ہٹلر کے اشارہ و ایما سے ہو رہا ہے، کیونکہ اس لائن کے مکمل ہونے کے بعد ہٹلر ہی اس سے فایدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔

اگر یہ ریلوے لائن مکمل ہو گئی تو خشکی کے راستہ سے نازی فوجیں ڈکر تک پہونچ سکیں گی جو جنوبی اٹلانٹک میں مغربی افریقہ کا مشہور بندرگاہ ہے یہاں سے نازی ہوائی جہاز چھ گھنٹے سے کم میں برازیل تک پہونچ جائیں گے اور گوڈ ہوپ کی طرف سے برطانیہ کا بحری راستہ بھی خطرناک ہو جائے گا۔

اب آپ افریقہ کا نقشہ سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ اس ریلوے کی صحیح پوزیشن کیا ہوگی۔ یہاں پہلے سے ایک ریلوے لائن موجود ہے جو بحر روم کے ساحل سے شروع ہوتی ہے اور فرانس کے افریقی مقبوضات (الجزایر) سے گزرتی ہوئی اٹلس پہاڑ کے جنوبی دامن میں (شہر کولمب بچار) تک چلی گئی ہے۔ دوسری لائن ڈکر سے مقام سیگو تک پائی جاتی ہے اور انھیں دونوں لائنوں کو ایک دوسرے سے ملانے کے لئے یہ نئی لائن بنائی جا رہی ہے چونکہ ریت پر پٹری نہیں بچھائی جا سکتی، اس لئے یہ لائن گھما پھرا کر صحرا کے اس راستے پر بنا رہے ہیں جو پتھریلا ہے اور اس طرح انجنیروں کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ ہاں پانی اور ایندھن کا سوال البتہ مشکل ہے، لیکن اسے یوں حل کیا گیا ہے کہ اس لائن پر ڈیزل انجن استعمال کئے جائیں گے جن میں پانی کا صرف بہت کم ہے اور ایندھن کا کام Pea nuts کے تیل سے لیا جائے گا جو اس حصۂ ملک میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔

گاڑی کی رفتار کا اوسط چالیس میل فی گھنٹہ ہوگا گو ضرورت کے وقت وہ ستر میل فی گھنٹہ تک چل سکے گی اور اس طرح بحر روم سے Niger تک دو دن میں پہونچ جائیں گے۔ ہر چند اس لائن کی مستقل تعمیر کے لئے تین سال چاہئے، لیکن عارضی طور پر کام نکالنے کے لئے چھ مہینے کافی ہوں گے اس وقت علاوہ بیس ہزار ہسپانوی باشندوں کے جو پچھلی جنگ اسپین میں یہاں نظر بند کر دئے گئے تھے بہت بڑی تعداد یوروپ کے دوسرے ممالک کے باشندوں کی ہے، جو نازی مظالم سے گھبرا کر یہاں چلے آئے تھے۔

اس لائن کا مرکز اس وقت Bour ہے جو بحر روم سے ۲۰۰ میل جنوب میں واقع ہے۔ یہ ایک گاؤں ہے جہاں بدوی عربوں کے صرف ۸۰ جھونپڑے ہیں، لیکن اب یہ ریلوے مزدوروں کی بہت بڑی کالونی بن گیا ہے۔

یہاں کا حال ایک جرمن باشندے نے (جو ہٹلر کا مخالف ہے) نہایت دردناک الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہ مقام اس قدر گرم ہے کہ اس سے پہلے کسی یورپین سے کام لینا یہاں قانوناً ممنوع تھا، لیکن اب فرانسیسی حکومت تمام ہسپانوی و غیر ہسپانوی پناہ گزینوں سے یہاں سخت محنت لے رہی ہے۔ روزانہ مزدوری ایک فرانک سے کچھ زیادہ ہے، لیکن چیزیں اس قدر گراں ہیں کہ اس رقم سے سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا خوراک کا انتظام بیشک حکومت کی طرف سے ہے، لیکن وہ بھی اتنا بدمزہ ہوتا ہے کہ کوئی کھا نہیں سکتا۔ کام کا اوسط اتنا زیادہ ہے کہ انتہائی محنت کے بعد بھی اسے پورا نہیں کیا جا سکتا اور سزائیں اتنی سخت ہیں کہ معاذ اللہ۔ مثلاً ایک سزا یہ ہے کہ پتھر اُٹھانے کے تسمیلوں کے دونوں مردوں سے چمڑا نکال کر تار لگا دیا جاتا ہے تاکہ یہ شانوں میں چبھتا رہے، چنانچہ یہاں کی گرمی میں بسا اوقات تار گوشت کے اندر پیوست ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی جوتا بھی چھین لیا جاتا ہے، تاکہ پاؤں میں چھالے پڑ جائیں۔

لباس کی کمی اتنی ہے کہ بدن پر کپڑے کے تاروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور بیماریوں کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے، کیونکہ افریقہ کے اُس صحرا میں تمام وہ بیماریاں پائی جاتی ہیں، جن سے جانبر ہونا محال ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیکڑوں کی تعداد میں یہاں موتیں ہوتی رہتی ہیں، لیکن کام بند نہیں ہوتا اور ہٹلر کی یہ ریل، فرانس کے روپیہ اور انسانوں کے خون سے برابر طیار ہوتی چلی جارہی ہے۔

لڑائی اور ریاضی

لڑائی میں اس وقت جتنے آلات استعمال ہو رہے ہیں ان سب کا تعلق ریاضی سے ہے کیونکہ اُن کی ساخت اتنی نازک و پیچیدہ ہے کہ بغیر ریاضی کی ناپ تول کے وہ مکمل ہو ہی نہیں سکتی، لیکن ریاضی کی ایک شاخ یعنی حساب و اعداد و شمار کا زیادہ تر تعلق جنگ کے مصارف سے ہے۔ آلات و مشینری کی ریاضی تو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، لیکن روپیہ آنا پائی کا سمجھنا مشکل نہیں۔

اس سے قبل کسی اشاعت میں ہم موجودہ جنگ کے حیرتناک مصارف کا ذکر کر چکے ہیں، لیکن آج اس مسئلہ کو دوسرے زاویۂ نگاہ سے ملاحظہ کیجئے:

یہ آپ نے بارہا سُنا ہوگا کہ حکومت برطانیہ کا صرفۂ جنگ ۱۶ ملین پونڈ روزانہ ہے۔ لیکن شاید سولہ ملین کہدینے سے آپ اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے لیکن اگر ہم اسے اعداد میں یوں ظاہر کریں:- (۱۶۰۰۰۰۰۰ پونڈ) تو شاید آپ بہتر طریقہ پر اس رقم کی عظمت کا تصور کرسکیں۔ یہ تو جنگ کے روزانہ مصارف کے اعداد ہیں، لیکن اگر فوجی مالیات کو آپ سامنے رکھیں گے تو اس سے زیادہ طویل اعداد و شمار سے آپ کو واسطہ پڑے گا۔

اگر ہم فرض کرلیں کہ یہ جنگ زیادہ سے زیادہ چار سال جاری رہے گی اور روز کے مصارف بھی یہی رہیں گے تو اختتام جنگ پر یہ میزان ۲۳۳۶۰۰۰۰۰۰ پونڈ تک پہونچ جائے گی۔ لیکن اس وقت سات حکومتیں برسرِ پیکار ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا صرف اوسطاً وہی ہے جو برطانیہ کا، اس لئے اگر ہم ان تمام حکومتوں کے چار سال کے مصارف کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ دنیا کو ۱۶۳۵۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔

یہ رقم اتنی بڑی ہے کہ ایک ایک پونڈ کے نوٹ بچھا کر آپ ۸۰۰ مربع میل کا فرش طیار کرسکتے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اگر آپ ہر قدم پر ایک اشرفی پھینکتے جائیں تو آفتاب تک پہونچتے پہونچتے بھی یہ رقم ختم نہ ہو اور اگر ہر منٹ پر ایک اشرفی ڈھالی جائے تو اتنی رقم پوری کرنے کے لئے تین لاکھ سال درکار ہوں گے

اس بیان سے تو جنگ کے چار سال کے مصارف بہت معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس سے زیادہ حیرتناک ریاضی یہ ہے کہ اگر آپ اس وقت صرف ایک پنی سود در سود کے حساب سے کسی کو قرض دیدیں تو ۶۰۰ سال کے بعد وہ ایک پنی اتنی ہی رقم میں تبدیل ہو جائے گی۔

تعمیر لینن گراڈ کی حیرتناک داستان

اگر لینن گراڈ اسوقت تک جرمنی کے قبضہ میں نہیں آیا تو حیرت نہ کرنا چاہئے، کیونکہ جن مصائب جھیلنے کے بعد یہ شہر تعمیر ہوا ہے وہ جرمن حملہ سے کہیں زیادہ سخت تھے۔ جب ۱۷۰۳ء میں پیٹر اعظم نے ایک شہر بسانے کا ارادہ کیا تو اسنے Neva کے غیر آباد، صحرائی جزیرہ میں ایک ایسے حصہ کو منتخب کیا جو حد سے زیادہ سیلاب زدہ تھا۔ گرمیوں میں یہاں کیڑے مکوڑوں سے بھری ہوئی کیچڑ کی دلدل ہو جاتی تھی اور جاڑوں میں چاروں طرف چار چار فٹ موٹی تہ برف کی جم جاتی تھی۔ چونکہ یہاں شہر کی بنیاد ڈالنے کے لئے کوئی چیز میسر نہ آسکتی تھی اس لئے پیٹر نے حکم دیا کہ روس کے دوسرے مقامات سے سامان لایا جائے اور اس کے لئے بے شمار مزدور متعین کئے گئے لیکن یہ سامان کہاں سے آتا؟ مجبوراً ایک دوسرے شہر کو جو اس سے قریب واقع تھا، مسمار کیا گیا اور وہاں کا نہ صرف سامان بلکہ وہاں کی آبادی بھی یہاں لائی گئی — یہاں کا قلعہ پانچ مہینے میں طیار ہوا جسکے لئے مٹی دوسرے مقامات سے لائی جاتی تھی۔ جب قلعہ کی تعمیر کے بعد یہاں کچھ آبادی بس گئی تو پیٹر نے حکم دیا کہ شہر آرک انگل کی تمام تجارت یہاں منتقل کیجائے۔ اسی کے ساتھ ماسکو کے تمام بڑے بڑے آدمی، تجار، صناع اور پیشہ ور زبردستی یہاں لائے گئے اس شہر کی قلعہ بندی کا بھی انتظام کیا گیا اور اس قدر انہماک کے ساتھ کہ پیٹر خود نگرانی کرتا تھا اور اسی کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق تمام استحکامات طیار ہوئے یہانتک کہ آج مضبوط سی مضبوط مشینیں بھی ان استحکامات کو سر کرنے میں آسانی سے کامیاب نہیں ہوسکتیں — پیٹر نے نظام کلیسا میں بھی اصلاح کرکے پیٹریارک کا عہدہ منسوخ کیا اور خود ہی اسکی جگہ لیلی۔ اسنے روس میں ایک نئی تقویم بھی جاری کی اور بجائے یکم ستمبر کے یکم جنوری کو نوروز مقرر کیا۔ اسنے یہاں چھاپے خانے بھی قائم کئے اور اپنی اڈیٹری میں اخبار بھی جاری کئے، اس نے علوم و فنون کے کالج بھی وہاں قائم کئے اور نظام معاشرت کے ہر ہر پہلو کو سامنے رکھ کر اس میں تبدیلیاں پیدا کیں — •

یہی وہ بادشاہ تھا جسنے روس کی سب سے پہلی بحری بیڑہ قائم کیا اور خود بھی بحری جنگ کی مشق میں حصہ لیا۔ جسوقت پیٹر مرا ہے، لینن گراڈ کی آبادی ۸۰ ہزار تھی، لیکن اب ۳۰ لاکھ سے زیادہ ہے۔ یہاں کے لوگوں میں اب تک وہ جفاکشی اور جانبازی موجود ہے جو کسی وقت پیٹر اعظم نے پیدا کی تھی۔

معمائے ہستی

اثر خامہ: جناب اثر لکھنوی

(حاجی ابوعلی الیزدی کی ایک عربی نظم سے متاثر ہو کر)

وہ وقت آیا قریب آخر، کہ ہوگی معزول شب کی ملکہ
بس اب تصرف میں رہ گیا ہے اخیر شب کا اخیر حصّہ
بجائے دیہیم اک کرہ ہے کہ جسپہ چھائی ہے تیرگی سی
سیاہ انجم نے کھایا گھونگھٹ، ہوا وہ ظلمت کا چاک پردا
وہ کھولی کرنوں نے اپنی چوٹی، پہاڑ کی چوٹیوں سے اٹکی
سپند وار آسماں کیجانب کُہر بھی انگڑائی لے کے اُبھرا
وہ پاکے بو راکبوں کی گھوڑوں کا ہو کے بیتاب ہنہنانا
وہ ہمہمہ ہے وہ غلغلہ ہے کہ جس سے شور نشور سہما
نقیب مشرق نے واکئے ہیں سنہرے ایوان کے دریچے
وہ اُٹھا طوفاں تجلیوں کا، وہ ہوگیا ختم خواب شبنم
حسین و نوخیز روز روشن ترانۂ صبح گا رہا تھا
عجیب دشوار منزلیں ہیں، عجیب پُرہول مرحلے ہیں
کہیں پہ ویراں پہاڑیاں ہیں کہیں پہ سنسان وادیاں ہیں
اور ان سے بڑھکر مہیب وحشی کمیں میں انساں بطرز حیواں
کہیں کہیں سنسناتے میداں میں نخل، جیسے ہو مست بادہ
ہرا میں پتّوں کا سرسرانا، اُبلتے چشمے کی یاد جیسے
کہیں کہیں سبز گھاٹیاں ہیں ہوائیں ہیں جن کو گدگداتی

وہ مملکت ہے نہ دبدبہ ہے، نڈھال سی چال، زرد چہرہ
ستارہ اک جھلملا رہا ہے نشاں گزشتہ شہنشہی کا
اُدھر بڑھا تا جدار مشرق، اُدھر ردا شب کے سر سے سرکی
وہ کھولا سورج نے اپنا پرچم، پڑھا صبا نے سحر کا کڑکا
ابھی دُھندلکا تھا گھاٹیوں میں کہ اُن پہ بھی اک لٹک سے لٹکی
اُبھر کے سمٹا، سمٹ کے پھیلا، بنے گا غازہ رخ سحر کا
قریب جب تک وہ آئیں آئیں، زمین ٹاپوں سے کھوندے جانا
ادھر تو کڑکی زمیں کی چھاتی، اُدھر کلیجا فلک کا دھڑکا
وہ دیکھا خورشید خاوری نے فصیل سے چرخ چاریں کے
نہائے نورانیت کے چشمے میں برگ و بار و بہار باہم
کمر کو باندھا جو کارواں نے روانہ ہونے کو سوئے صحرا
جو اس جگہ زمہریری خطّے تو اُس جگہ گرم منطقے ہیں
کہیں جو ہیں گھات میں درندے تو غول صحرا یہاں وہاں ہیں
لہو کا پیاسا، حریص و جابر، کہ جس سے ہو گرگ بھی پشیماں
لچکتے قامت کا لہلہانا کہ جسپہ لہلوٹ خود ہے سایہ
برستے پانی کی جھم جھماہٹ، دل حزیں بھی ہو شاد جس سے
وہ بہتی زلفیں، وہ نرم پہلو، کہ بحر کو جھرجھری ہے آئے

قریب ساحل کے سینہ تانے، غریب مانجھی کا دل لبھانے
مگر یہ اُن کے لئے ہے ساماں، امید ہے دستگیر جن کی

اور ایک ہم ہیں کہ اپنا مرکز بجائے فردا کے حال ٹھہرا
جو وقت کی رہگزر میں ملنے کا جز جدائی نہیں نتیجہ

جدا جو ہونے کو ہم ملے ہیں تو کیا جدا ہو کے پھر ملیں گے
نہ ہوگا ایسا کہ ہوگا ایسا یہ شبہ ہوتا ہے دل میں پیدا

یہ بات ڈالی ہے کس نے دل میں، کھلا نہ انساں پہ راز اسکا
ملیں تو کیوں اور مل گئے تو جدا پھر اک دوسرے سے کیوں ہوں

مجاز ہم ہیں نہ دخل ہم کو، کبھی لیا عندیہ کسی نے ؟
کہاں سہانی وہ شام عشرت، تمام نغمہ، تمام راحت

سیاق میں زندگی کے لیکن شمار یہ بھی ہے اور وہ بھی
شکستہ دل ہوں، فسردہ خاطر، دماغ جیسے چراغ کشتہ

حواس مختل، نظر پریشاں، رگوں میں اک تھرتھری بھری ہو
جسے بھی دیکھو اُسے تغیر، جو شے ہے بیزار کرنے والی

شباب کے دوستوں کو پہونچے سلام آخر مری طرف سے
یہ وقت کایا پلٹنے والا، کرے گا طیار اور خاکہ

جو صبح کی ٹھنڈی روشنی تھی، ہوئی تمازت جب اُس میں پیدا
وداع ہوتا ہوں اب میں تم سے، یہی تھا انجام آشنائی

یہ ہو کے بن اور یہ تپتے میداں کہ ذرہ ذرہ ہو شعلہ ساماں
خیال ماضی کے عود کرتے ہیں اس خرابے میں آہ کیا کیا

نہ جانے کھو جاتی پھر کہاں ہیں اُفق سے ہو ہو کے پار نظریں
نگاہ مغموم کو ستاتی ہیں کیوں یہ پرچھائیاں اُبھر کے

سوالوں کا ایک سلسلہ ہے، کہاں سے آئے کدھر ہو جانا
خیال میں انتشار تاہم شدید و بے سود یہ تمنا

دوام دو اور اُنکے مابین ایک نقطے پہ ہم ٹکے ہیں

تسلیاں دیکے غم بٹانے، غموں کی پھر یاد بھی بھلانے
وہ جنکی روحوں کا ہے نشیمن، بہشت کی خوشگوار خنکی

یہ سوچ رہتا ہے لحظہ لحظہ کہ زیست کا کیا مآل ٹھہرا
تو ایسے ملنے کا مدعا کیا، فراق ہے جس کا پیش خیمہ

جو پھول مرجھا چکے ہیں اکبار کیا وہ مرجھا کے پھر کھلیں گے
وہ غیب دانی (کہ منگڑہت ہے) یہ کہہ رہی ہو کہ ہوگا ایسا

نہ کھل سکا ہے نہ کھل سکے گا، نہ جانے کتنوں نے سر کھپایا
یہ ناگزیری، یہ تلخ کامی، کہیں اگر کچھ تو سرنگوں ہوں

سپرد تقدیر کر دیا ہے، خدا نے یا اپنی بے بسی نے
کہاں یہ غمگیں سحر الٰہی، عذاب یکسر، کمال زحمت !

نہیں ہے تفریق یکسر مو، اگرچہ ہے فرق اور بدیہی
"نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" مثال حرف غلط نوشتہ

گزشتنی ہے جہان فانی، جو ہے تو پائندہ ابتری ہے
یہاں کا جینا بھی ہے خیالی، یہاں کا مرنا بھی ہے خیالی

یہ مانا ہم پھر کبھی ملیں گے، مگر نہ اس طرح پھر ملیں گے
ہمیں وہ ہوں گے مگر نہ ہوں گے، فساد ایسے کھڑے کریگا

تو دن ڈھلا اور شام آئی، اور اُس کا انجام کار ہے تڑکا!
صدا جرس کی ہو سر بصحرا، یہ دل کی دھڑکن پیام لائی

خدا کی اک ذات کے سوا ہے یہاں کسے زندگی کا امکاں
تغیرات اور اُن کے اسباب کرتے ہیں انتباہ کیا کیا

تلاش کس کی ہے، آرزو کیا، جو اُٹھتی ہیں بار بار نظریں
نکل پڑے ہیں کہاں سے یارب یہ قبر کے تیرہ خام سائے

اگر ہے جانا تو کب ہے جانا، قضا نے ڈھونڈا ہے کیا بہانا
کہ پڑھ لے انسان کلک قدرت نے جو ہے اُسکی جبیں پہ لکھا

وہ خوفناک اُنکے بھید جنکے ہجوم شبگوں میں ہم گھرے ہیں

وہ سوگوار اُنکی ظلمتیں ہیں ستم جو آنکھوں پہ توڑتی ہیں
یہ گھُپ اندھیرا یہ وحشی موجیں، یہ رقص گرداب، یہ ہوائیں
جنھیں میسر ہے امن ساحل ہماری اُن کو خبر ہو کیونکر
شراب اور عشق کے مغنّی کا گیت تھا جو ابھی سُنا یا
مگر وہ کمبخت جس کی عمر طبیعی ٹھہری ہے نین بیسی
مرے حواسوں کو باختہ کرتی ہیں نہ خوش کرنے والی خوشیاں
کبھی تو اک ساتھ سب کا حملہ، کبھی مقابل ہر ایک تنہا
عجیب خوش فہم تھا وہ دانا کہ جس نے یوں حل کیا معمّا
انیس خلوت جو دخت رز ہو تو اُٹھے کچھ لُطف زندگی کا
لگائی صوفی نے ہانک بڑھکر کہ "خاک ہے جزو خاک ہوگا"
تجھے ملی روح کی جو دولت تو فرض ہے یہ پتا لگانا،
مگر یہ تھا جستجو کا ثمرہ، ندامتیں، رونا، کڑھنا، مرنا
یہ اُس کا نغمہ تھا جو فنا و بقا کے چکّر میں پڑ گیا ہے
گناہوں پر اشکبار ہو کر، کہا یہ ہم سے مسیحیت نے
یہ لفظ کچھ کم ہیں یا زیادہ، الٰہی اک آن کو دکھا دے
یہ قول ہے ایک ناستک کا، "خودی کو پوجو، خدا تمھیں ہو"
مجھی میں جلوہ ہے نور حق کا، میں ہی حقیقت، میں ہی صداقت
اگر تھا منصور مرد دانا، تو اُس سے بڑھ چڑھکے تھے وہ دانا
یہ مانا ہر قطرے سے لہو کے صدائیں "حق حق" کی آ رہی تھیں
"جو چاہو وہ کھاؤ اور پیو تم، مگن رہو، چھوڑو فکر کل کی
یہ قول اک بادشاہ کا ہے، بجا گیا چین کی جو بنسی،
یہ آدمی ننگ آدمیت جو گھاس سمجھا ہے زندگی کو
نہاد اسکی ہے چونکہ خاکی، یہ پستیوں کی طرف ہے مائل
مگر بتائیں وہ جنکی پرداخت اچھے ماحول میں ہوئی ہے
خواص تم میں کہاں سے پیدا ہوئے ہیں گھوڑوں اور گدھوں کے

کبھی جو مٹتے نہیں مٹائے، نقوش وہ گہرے چھوڑتی ہیں
وہ چیخ کے بعد کی خموشی، وہ چڑھتے طوفاں کی سائیں سائیں
خبر ہو لیکن نہ آنکھ نم ہو، خبر نہ ہونا ہی اس سے بہتر
بہشت اور حورعین و کوثر کے خواب جو دیکھتا رہا تھا!
جو اک طرف مختصر ہے کتنی تو اک طرف ہے طویل کیسی
شراب، حوریں، محبت اور اُن سے جو ہے منسوب ساز و ساماں
پناہ مانگو، پناہ مانگو، کہ ہوگا شکل بچھڑانا پیچھا
خرد ہوئی خشک اور کہنہ، اسے ہے لازم طلاق دینا
نکاح ثانی اسی سے کیجئے... کوئی ٹھکانا ہے الٰہی کا!
مراد اس سے فنائے تن ہے، نہیں ہے کچھ روح سے علاقہ
کہ اصل مقصود اس کا کیا ہے، کہاں ہے اس چشمے کا خزانہ
تذبذب اچھا ہے چشم بینا کہ راہ یہ اختیار کرنا؟
شکار اپنے فریب کا ہے، شکار کرنے چلا تھا "لاشے"!
طمانیت، وہ سنی نہ دیکھی جو بخشی ہے میری "سلطنت" نے
وہ خلد جلوے سے جس کے کھِل جائیں دیدہ و گوش آدمی کے
خدا نہیں ہو تو کیا ہو پھر تم، اگر خدا سے جدا نہیں ہو؟
خدا نہیں ماسوا "انا" کے یہی ہے روشن بس ایک آیت
کہ جس کے سنگ دساں کا آخر غرور اُس کا ہوا نشانا
وہ ہڈیاں چور چور ہو کر کسی کے بھی جوڑے جُڑ سکی تھیں؟
گراں بغیر اس کے زندگی ہے شراب کے ایک جرعہ سے بھی"
زبان ملتی جو خوک کو بھی تو کہتا "یہ تو ہے میری بیتی!"
یہ مر کے بنتا ہے گھاس پھر خود، مویشی چرتے ہیں پھر اسی کو
ذلیل خوشیوں کو ڈھونڈتا ہے جو اسکے حق میں ہیں سمّ قاتل
بلندیوں پر ہے جنکا مسکن، تمھاری مت کیوں پلٹ گئی ہے
تمھاری غیرت کو کیا ہوا ہے، یہ کیسے اطوار تم نے سیکھے

جب ایک زاہد سے میں نے پوچھا، یہ بڑبڑاتا ہوا وہ گزرا
یہ کہکے بیت الحزن کی جانب چلا وہ کرنے کو آہ و زاری
یہ زیر کی تیری اللہ اللہ حیات مابعد پر تو ایقاں
بتا تو کچھ راز زندگی سے بھی تجھ کو اے شخص آگہی ہے
جوان تو، پیر زال دنیا، عظیم وہ ہے، حقیر تو ہے
سمجھنا اپنے کو حاصل کُل تری دنائت ہے گمرہی ہے
نہ تجھ کو قدرت، نہ تجھ میں طاقت، ہما ہمی دیکھنے ہی کی ہے
تو اک دقیقہ کی بے ثباتی وہ جبکہ ہو سانس آتی جاتی
یہ تیری ہستی کہ جیسے طائر قفس میں ہو دور آشیاں سے
مگر ہے پھر بھی یہ تجھ کو حیرت، یہ کیوں ہے، کب سے ہے، وجہ کیا ہے
تو اور لافانی، کیا جنوں ہے، خبر ہے آیا جہاں میں کیونکر
ترا وجود اس کا ہے نتیجہ مچا تھا اک دُند خواہشوں کا
وہ تو کہ بچوں کی طرح حیران ہو کے ہر شے کو دیکھتا ہے
فنا کے جھونکوں میں ہو رہا ہے کہ جیسے آندھی میں خشک پتا
تجھے نہ تھا اس سے پہلے بہرہ، تمیز سے کچھ نہ ہوش سے کچھ
ہزار خطروں میں تو گھرا ہے، ہمیشہ گریاں ہے شاد خنداں
یہ تیری برخود غلط پسندی، یہ کس مپرسی کا اُسپہ عالم
تجھے نہیں علم کیوں تو آیا، کہاں سے آیا، کہاں ہے جانا
تجھے ہے لیکن گھمنڈ پھر بھی کہ بہترین شاہکار تو ہے
حریص عیش دوام، غفلت میں تیرے لیل و نہار گزرے
یہ زرد چہرہ، یہ سرد اعضا، یہ جسم لاغر، یہ ہیٹی قسمت

حیات بعد الممات سب کچھ، نہیں ہے دُنیا کا کچھ بھروسا
بیاد عصیاں، بخوف دوزخ، بہ بیم پرسش، بہ ترس خواری!
مگر فسانہ جو عہد ماضی، تو حال اک خواب ہے پریشاں!
کہ عیش جنت، عذاب دوزخ ہی کی فقط رٹ لگی ہوئی ہے
مثال ذرہ گریز پا ہے، خودی کا اپنی اسیر تو ہے
وہ تو کہ اک خواب ہے خراماں، خبر نہ سر کی نہ پیر کی ہے
ابد کی بنیاد اور تجھ پر، چلا چلی جب لگی ہوئی ہے!
یہ طبقہ اسفل، یہ تیری حالت، مگر یہ دعوے، خودی کے ماتی!
قفس بھی وہ "سخت گیر مرضی"، ٹلے نہ جو آسماں کے ٹالے
کہاں سے آئے، کہاں ہے جانا... پھر ایک حیرت! یہ قصہ کیا ہے؟
دو پائے، دو جانور ملے تھے.... اور آگے اک شرمناک منظر!
یہ تیرا نقشہ اور اُس پہ غرّہ کہ تیری خاطر ہے سب تماشا!
نکل کے ظلمت سے اول اول دو چار انوار سے ہوا ہے
پھوار بوندوں کی یا ہو جیسے، ہوا نے پیہم جسے نچوڑا
نہ تجھ کو قردا کی آگہی تھی، نہ واقفیت تھی دوش سے کچھ
کبھی ہے سینہ تنور سوزاں، کبھی ہے آہوں کا گرم طوفاں
کبھی ہے بازیچہ گاہ حرماں، کبھی ہے پامال غصہ و غم
نہ وقت جانے کا تجھ کو معلوم، پھر بھی بنتا ہے تو سیانا
یہ خواب بیداریوں میں احمق، بڑا ابنا ہوشیار تو ہے
بہت ہی ناکامیاب گزرے، بہت ہی ناخوشگوار گزرے
مگر یہ کاوش فسانہ کہہ دوں.... جو دے بھی مہلت زباں کی لکنت

(نگار) جناب اثر نے یہ نظم عربی کی ایک نظم سے متاثر ہو کر لکھی ہے جو انگریزی زبان میں منتقل کی گئی تھی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ عربی کی اصل نظم کتنے تصرف کے بعد انگریزی میں پہونچی لیکن جناب اثر نے جس انداز سے اسے اُردو میں پیش کیا ہے اسے دیکھ کر —— برتنش پیراہن گل تنگ بود۔ کا سماں سامنے آجاتا ہے۔

ایسا مشکل موضوع، ایسے عمیق خیالات اور یہ سلجھا ہوا اسلوب بیان! ایسے "ملکۂ شعر" کا مالک یقیناً "ملک الشعراء" ہے۔

(بہ سلسلۂ صفحہ نمبر ۲) اس لئے اب اگر اسٹالن گراڈ پر جرمن قبضہ ہو بھی جائے تو یہ اس کی کامیابی نہ ہوگی، بلکہ اسے روس کی کامیابی خیال کیا جائے گا جس نے ہٹلر کے پروگرام کو درہم برہم کر دیا اور امسال قفقاز میں اس کے کامیاب اقدام کو دشوار بنا دیا۔ اگر اسٹالن گراڈ پر ہٹلر کے پروگرام کے مطابق ستمبر میں قبضہ ہو جاتا تو آج جنگ کی صورت غالباً مختلف ہوتی، یعنی بہت ممکن تھا کہ بحر اسود کی طرف باطوم تک نازی فوجیں پہونچ گئی ہوتیں، اور بحر خضر میں استراخان تک اس کا قبضہ ہو گیا ہوتا اور اگر وہ باکو کے چشموں تک نہ پہونچ سکتیں تو بھی قفقاز اور شمالی روس کا تعلق منقطع ہو جانا یقینی تھا۔ اسی کے ساتھ ممکن تھا کہ مصر کے محاذ پر بھی جرمن اقدام بدستور جاری رہتا، لیکن اب یہ سب کچھ دشوار ہو گیا ہے اور اگر فی الحال جاڑوں میں نازی فوجوں کو اسٹالن گراڈ میں سر چھپانے کی فرصت مل بھی جائے تو وہ روس کی ان طیاریوں کو کسی طرح نہیں روک سکتیں، جن سے پھر آیندہ گرمیوں میں اسے مقابلہ کرنا ہے اور جو پھر ہٹلر کے بنے بنائے پروگرام کو درہم برہم کر سکتی ہیں ——— بہر حال وقت سے جو فایدہ جرمنی کو پہونچ سکتا تھا وہ اسے حاصل نہ ہو سکا اور معرکۂ اسٹالن گراڈ کو جو اہمیت پہلے حاصل تھی اب وہ باقی نہیں رہی

اکتوبر میں بحر الکاہل (پاسفک) کے اندر بھی ہلچل پیدا ہوئی، اور جزایر سلیمان کے لئے جو مقابلہ جاپان و امریکہ میں شروع ہوا تھا، وہ بدستور جاری ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس وقت تک جو کچھ ہوا ہے، وہ اتحادیوں ہی کے حق میں ہوا ہے، لیکن اسی کے ساتھ جاپان کو بھی اب اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ پچھلے سال جن حالات میں اس نے جنگ شروع کی تھی وہ اب بدل گئے ہیں، اور سنگاپور و برما کی سی آسان کامیابیاں اب بہت دشوار ہیں۔ جاپان نے آسام کے بعض مقامات پر ہلکی سی ہوائی تاخت کر کے، ہندوستان اور خصوصیت کے ساتھ بنگال میں بھی بے چینی پیدا کرنا چاہی، لیکن اس کا یہ وار اوچھا ثابت ہوا اور جب تک بحر الکاہل اور چین میں اس کا دامن اُلجھا ہوا ہے، ہندوستان کا گریبان محفوظ نظر آتا ہے

مصر کے محاذ پر، طبروق کے سقوط کے بعد، بالکل پہلی مرتبہ اتحادی فوجوں نے جارحانہ اقدام شروع کر دیا ہے اور محوری فوجیں مدافعت پر مجبور ہو گئی ہیں۔ نتیجہ جو کچھ ہو، لیکن اس سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ مصر پر خطرات کے جو بادل چھائے ہوئے تھے وہ چھٹ چلے ہیں، اور جب تک کوئی دوسری صورتِ حال نہ پیدا ہو، موجودہ حالات اطمینان بخش ہیں

اس دوران میں برطانیہ نے جرمنی کے بعض اہم مقامات پر ہوائی حملے بھی کئے اور ان حملوں کی نوعیت بھی مختلف تھی، یعنی ان سے معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ جو کچھ کر رہا ہے کافی اعتماد کے ساتھ کر رہا ہے اور جرمنی کو فضائی جنگ میں پوری قوت کے ساتھ چیلنج دینے پر آمادہ ہے

بحر روم میں جزیرۂ مالٹا پر شروع ہی سے محوری حملے ہو رہے ہیں اور اس دوران میں ان کی شدت بہت زیادہ ہو گئی ہے، لیکن اس مختصر سے جزیرہ کا ابتک باقی رہنا اس کا ثبوت ہے کہ برطانیہ کی قوت مدافعت نے فضا میں بہت ترقی کر لی ہے اور چونکہ مالٹا اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے مصر و مشرق قریب کے درمیان ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے بحر روم میں محوری خطرات کا مشرق کی طرف پھیلنا بھی فی الحال ممکن نہیں۔ بہر حال یہ بات اب روز بروز واضح ہوتی جا رہی ہے کہ جہاں تک وقت کا تعلق ہے اس سے اتحادی فایدہ اُٹھا رہے ہیں اور لڑائی کی مدت جتنی زیادہ بڑھتی جا رہی ہے، محوری کامیابیوں کا امکان بھی اتنا ہی ضعیف ہوتا جا رہا ہے

اس لڑائی میں وقت کا عنصر امریکہ کی شرکت کی وجہ سے اتحادیوں کے حق میں زیادہ مفید ہو گیا ہے، کیونکہ ہر آنے والے دن کے ساتھ امریکی طیارہ بڑھتی جا رہی ہیں اور امریکہ کی زمین نے وہ سونا جس سے وہاں کے تہ خانے دھنسے جا رہے تھے، اب بحری و ہوائی جہازوں، ٹینکوں اور بموں کی طیاری کے لئے اُگل دیا ہے، چنانچہ جو اعداد و شمار وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۳ء کے آخر تک دُنیا کے تمام سمندروں میں ہر جگہ اسی کے جنگی جہاز بکھرے ہوئے نظر آئیں گے اور دُنیا کی فضا کا کوئی حصہ ایسا نہ ہوگا جو اس کے طیاروں کی پرواز سے بچ رہا ہو

بہر حال جو حالات اس وقت پیش نظر ہیں وہ نہایت ہولناک مستقبل کا پتہ دے رہے ہیں اور جیسا کہ ہم پچھلے مہینے ظاہر کر چکے ہیں، اس جنگ کے جلد ختم ہونے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور کسے خبر ہے کہ جب یہ آگ سرد ہونے پر آئے گی تو روئے زمین کا کتنا حصہ خاک سیاہ ہو چکا ہوگا۔

آئندہ جنوری کا "نگار" ریاض نمبر ہوگا

بزم اسیر و امیر کے آخری یادگار ریاض خیرآبادی (مرحوم) کی شاعری سے کون واقف نہیں، لیکن اس زندہ دل ہستی کے ادب اُردو پر اور کتنے احسانات ہیں، اس سے کم لوگ آگاہ ہوں گے۔ نگار کے اس خاص نمبر میں آپ کو ریاض مرحوم کے لطائف شعر و سخن، ان کے خود نوشت سوانح حیات، نثر نگاری کے معیاری نمونے، ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بسیط تبصرہ اور انتخاب کلام سبھی کچھ نظر آئے گا۔ ریاض مرحوم کی زندگی کا وہ زمانہ جب ان کے ریاض الاخبار اور فتنہ کی دھوم مچی ہوئی تھی، اب بالکل بھلایا جا چکا ہے، لیکن نگار کے اس نمبر میں اس کو پھر سامنے لایا جائے گا اور اُن لطیف صحبتوں کی یاد پھر تازہ کی جائے گی۔ جو ریاض اور اُن کے زمانہ کے لئے مخصوص تھیں۔

اس نمبر میں ریاض کی تمام تصانیف کے سلسلہ میں ناول نظارہ کا بھی اقتباس دیا جائے گا جو اسوقت تک شایع نہیں ہو سکا۔ الغرض یہ نمبر ادبی دلچسپیوں کا نہایت عجیب و غریب مجموعہ ہوگا اور اس کی ضخامت نگار کی موجودہ ضخامت سے کم از کم تگنی ہو گی اور اگر کاغذ میسر آگیا تو شاید اس سے بھی زیادہ — حضرت ریاض کی تصویر بھی دیجائے گی اور سرورق بھی نفیس کاغذ کا ہوگا۔

غیر خریداران نگار سے اس کی قیمت علاوہ محصول ڈاک ڈیڑھ روپیہ سے کم نہ ہوگی۔ لیکن خریداران نگار کو حسب دستور یہ نمبر ان کے سالانہ چندہ ہی میں دیا جائے گا۔

منیجر

کچھ "نگار" کے متعلق

آیندہ ماہ دسمبر سے نگار کا موجودہ حجم کچھ بڑھ جائے گا اور خط بھی کچھ واضح ہو جائے گا، لیکن یہ تمام کتر بیونت اسی وقت تک ہے جب تک کاغذ نہیں مل رہا، لیکن جب یہ دشواری جاتی رہے گی تو نگار پھر اُسی کاغذ اور اُسی مسطر پر شایع ہوگا جو جنگ سے پہلے تھا اور سرورق بھی بہترین کاغذ کا علٰحدہ لگایا جائے گا اور ضخامت بھی بڑھ جائے گی۔

ہر چند مضامین کے لحاظ سے اب بھی نگار میں ۸۰ صفحات سے زیادہ کا مواد دیا جاتا ہے، لیکن خط باریک ہونے کی وجہ سے بعض حضرات کو دقت ہوتی ہے، جس کا ہمیں احساس ہے۔

ہر چند جو زمانہ آنے والا ہے اس میں کاغذ کی کمیابی، نایابی کی حد تک بڑھ جائے گی، لیکن آپ مطمئن رہیے، نگار بہر حال جاری رہے گا اور مضامین کے لحاظ سے اس میں کوئی کمی نہ ہوگی، گو ظاہری شکل و صورت اس کی اچھی نظر نہ آئے۔

نگار اہل نظر کا پرچہ ہے نہ کہ تماشائیوں کا اس لئے ہمیں امید ہے کہ قارئین نگار اسکی عارضی بدنمائی کی پروا نہ کریں گے۔

منیجر "نگار"

مطبوعہ نگار پریس بینک روڈ رامپور، پبلشر و پرنٹر ایس حسین